لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زرِ تعاون

اندرونِ ملک ــــــ بیس روپے

فی پرچہ ــــــ ایک روپیہ

بیرونِ ملک۔ بحری ڈاک، بحری ممالک ۵ پونڈ

ہوائی ڈاک

ایشیائی ممالک ــــــ ۷ پونڈ

افریقی ممالک ــــــ ۸ پونڈ

یورپ و امریکہ ــــــ ۱۰ پونڈ

جلد نمبر ۱۸ | ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۸۱ء ـــــ ۱۷ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۱ھ | شمارہ نمبر ۱۰

اداریہ

ع۔ ع۔ ن

مذاکرۂ علمیہ کا موضوع اور مقصد

اسی اپریل کی ۱۷ر سے ۱۹ر تاریخ تک ندوہ میں ایک بین الاقوامی سطح پر مذاکرۂ علمیہ (سیمینار) انشاء اللہ منعقد ہوگا، جس میں توقع ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر سے متعدد اہلِ علم، صاحبِ قلم اور ادباء جمع ہوں گے، کوئی عام اجتماع پروگرام میں داخل نہیں۔

اس سیمینار کا موضوع " ادبیات میں اسلامی تصور " کی تلاش ہے، ضرورت ہے کہ اس موضوع کی کسی قدر تشریح کردی جائے۔

ادب کی خواہ جو بھی تعریف کی جائے اور اس کے جو بھی فنی اصول و حدود طے کئے جائیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ادب کا لفظ سنتے ہی ہمارا ذہن شعر و شاعری، افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کی طرف منتقل ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ اہلِ علم سنجیدہ علمی مقالات، تنقید یا تاریخ ادب پر لکھے ہوئے مقالات کو بھی اس میں شامل سمجھتے ہیں، دینیات اور مذہب و اخلاق کے اصول، تاریخی بیانات کو ادب سے علیحدہ ایک صنف سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی بلاغت پر مسلمانوں کا ایمان ہے، لیکن یہ ایمان بالغیب ہے، جیسے مرنے کے بعد کی زندگی، حشر و نشر پر ایمان۔

دوسری طرف ادب کے نام پر نہ صرف مخربِ اخلاق لٹریچر کی پرورش ہو رہی ہے بلکہ ایسا لٹریچر تیار ہو رہا ہے جس میں براہِ راست مذہب پر حملہ تو کم ہوتا ہے، بالواسطہ اس کی تحقیر و تذلیل کی کوشش بہت باریک بینی اور منصوبہ بندی کے ساتھ عمل میں آتی ہے۔

اہلِ دین و دانش علماء اس حقیقت سے آگاہ ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جو نسل اس ادب سے فکری غذا پا رہی ہے اس سے کسی تعمیری کام میں حصہ لینے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اسلام دشمن تحریکوں نے اس راز کو ایک صدی پہلے پا لیا تھا کہ ادب کی راہ سے اپنے تخریبی فلسفے کا پروپیگنڈہ کرے، جنس و شکم کو محور بنا کر نئی نسل کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کو " ادب برائے زندگی " اور " نیا ادب " کا خوشنما نام دیا گیا۔

ندوہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ ادب و زبان کی قوت اور تاثیر کو سمجھے اور اس کو دینی خدمت کا ذریعہ بنائے، عربی زبان جو اسلامی درسگاہوں کا بنیادی مضمون ہے اور جس کی اہمیت رہی ہے جو نماز کے لئے وضو کی ہے، ندوہ نے پہلی بار اس کو ایک زندہ اور جاندار موضوع کی طرح اپنے نصاب میں اہمیت دی لیکن اس کی منزل صرف یہی نہیں تھی کہ فنِ تعلیم کے اصول اور تسلیم شدہ فلسفہ کی روشنی میں ادبیات کا نصاب تجویز کرے، اور " نفحۃ الیمن " جیسی لغو اور مخربِ اخلاق کتابوں کو نصاب سے خارج کرکے اس کی جگہ صحیح قرآنی عربی میں لکھی ہوئی ریڈروں کو منتخب کرے، اور اس مضحکہ خیز صورتِ حال کو ختم کرے کہ ایک طرف نثر کی ابتدائی کتاب پڑھائی جائے جس کی نہ عربیت درست اور نہ اس کا ذوق و فہم سے کوئی تعلق اور اس کے بعد مقاماتِ حریری کی کتاب پڑھائی جائے جو عباسی دور میں صنائع و بدائع کے اعلیٰ نمونے کے طور پر مرتب کی گئی تھی اور نثر جس کا تعلق کتاب اللہ اور احادیث کے سمجھنے سے براہِ راست تعلق ہے اس کو نظر انداز کرکے نظم پڑھائی جائے، ندوہ نے یہی نہیں کیا بلکہ ادب کو مسلمان کرنے کا فرض بھی انجام دیا۔ اچھی، دل نشیں اور اصولِ تعلیم کے مطابق تدریجی ارتقاء کے قانون کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا سلسلۂ نصاب خود بنایا۔ قصص النبیین کے تین حصے، القراءۃ الراشدہ کے تین حصے، منثورات اور مختارات کا پورا سٹ تیار ہوا، جس کی بنیادی فکر یہی ہے کہ ادب اسلام کا خادم ہے، اسلام کے تابع ہے، اسلام سے علیحدہ نہیں ہے، الحمد للہ اس نصاب کی پذیرائی وہ ہوئی جو برصغیر کی تاریخ میں کسی علمی کوشش کی پذیرائی نہیں ہوئی ہوگی، عرب ممالک کے چوٹی کے مسلم مفکرین، صاحبِ قلم اور نصابِ تعلیم مرتب کرنے والوں نے نہ صرف اس کو سراہا بلکہ پوری وسعتِ قلبی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ عربوں کو اپنی زبان پڑھنے کے لئے اسی " ہندوستانی مدرسہ " سے استفادہ کرنا چاہئے، چنانچہ گذشتہ سال مختارات کے ۲۵ ہزار نسخے بیروت میں چھپے ہیں اور سعودی عرب کے نصاب میں داخل کی گئی، قصص النبیین بھی مصر اور دمشق سے شائع ہوئی اور شام کے مدارس میں اس کو داخل کرنے کی سفارش کی گئی، یہ اعتراف و تحسین قابلِ ذکر اس لئے ہے کہ مصنف کے حلقۂ بگوش ہم وطنوں کا یہ اقدام نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جن کی زبان عربی ہے اور

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بیس روپے ارسال فرمائیے۔ اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی۔ سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع وی۔ پی خرچ Rs.23/25 کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

کتاب و سنت سے

بیوی پر شوہر کے حقوق

مولانا عبد الحی حسنیؒ

آیت :

الرِّجال قوامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علیٰ بعض و بما انفقوا ۔ (سورۂ نساء آیت ۳۴)	مرد عورتوں پر حاکم و مسلط ہیں اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شوہر گھر میں موجود ہو (سفر وغیرہ میں نہ ہو) تو اس کی اجازت کے بغیر کسی عورت کو روزہ (نفل) رکھنا جائز نہیں، ایسے ہی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر میں کسی کو آنے کی اجازت دینا بھی درست نہیں۔ (متفق علیہ بالفاظ بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر شوہر بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ نہ آئے اور شوہر ناراضگی میں رات گذارے تو فرشتے اس عورت پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (متفق علیہ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جہنم دکھائی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس میں وہ عورتیں زیادہ ہیں جو کفر کرتی ہیں۔ آپ سے سوال کیا گیا، کیا وہ اللہ کا انکار کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ شوہر کی ناشکری کرتی ہیں، اس کے احسان کی ناشکری کرتی ہیں، اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ عمر بھر احسان کرو پھر تمہاری طرف سے کوئی ناگوار بات دیکھے تو کہے گی تم نے میرے ساتھ کوئی بھلائی کی ہی نہیں۔ (بخاری)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو عورت اس حال میں مری کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہے وہ جنت میں داخل ہوگئی۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر کسی کے لئے کسی شخص کو سجدہ کرنا جائز قرار دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سی عورت سب سے اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا، سب سے بہتر وہ عورت ہے کہ شوہر اس کو دیکھے تو خوش ہو، کوئی حکم دے تو وہ اس کو بجا لائے اور اس کی عدم موجودگی میں اپنی ذات یا شوہر کے مال میں ایسا تصرف نہ کرے جس کو شوہر ناپسند کرتا ہو۔ (نسائی)

حضرت حصین بن محصن رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ ان کی ایک پھوپھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ نے ان سے پوچھا، کیا تمہارے شوہر ہیں، انھوں نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے فرمایا تمہارا ان کے ساتھ کیا معاملہ رہتا ہے، انھوں نے جواب دیا میں ان کی کوئی پرواہ نہیں رکھتی ہوں سوائے ایسے کام کے جس کو میں خود نہ کر سکوں۔ آپ نے فرمایا، یہ تم اس کے ساتھ کیا کرتی ہو؟ وہی تمہاری جنت و دوزخ ہے۔ (نسائی)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اس عورت کی طرف نہ دیکھے گا جو اپنے شوہر کی شکر گذار نہ ہو جب کہ وہ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ (نسائی)

بقیہ صفحہ ۳ : اداریہ

جو اپنی مادری زبان (عربی) کے ادیب اور صاحبِ قلم ہیں۔

ندوہ کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے، اب تک جو ہوا وہ ٹھوس اور پائیدار لیکن خاموش خدمت کا پہلا اور دوسرا قدم تھا، اب یہ فکر دامن گیر ہے کہ اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ ادب صرف اسی مجموعہ کا نام نہیں ہے جو ہمیں اس نام سے موسوم مجموعہ میں ملا ہے، یعنی نظم و نثر کا مجموعہ، افسانہ، ڈرامہ اور ناول جس کو ہم ادب سمجھتے آئے ہیں، یہ ادب کی مسخ شدہ اور غلط العوام نمائندگی ہے اصل ادب وہ ہے جو قرآن کریم ہے، احادیث نبویہ میں ہے، تاریخ و سیر میں ہے، اہل اللہ کے ملفوظات و مکتوبات میں ہے، لہٰذا ادب کو " اسلامیانے " یا اسلامی ادب ہمیں تصنیف کرنے کی ضرورت کم ہے، زیادہ ضرورت یہ ہے کہ اس علمی ورثہ کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے، جن کے اندر ادب کے بیش بہا موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی کتاب " مختارات " میں علاوہ جوامع الکلم خطباتِ نبویہؐ اور صحابہ کرام کی تقریروں کے صحیح بخاری کی دو طویل حدیثیں بھی نقل کی ہیں، ایک حدیثِ افک ہے، جس میں روزمرہ کے محاورات، آپس کی گفتگو، بے ساختہ ترکیبیں کثرت سے ملتی ہیں اور یہ بہترین نمونہ ہے اس ادب کا جو ہمیں کتاب الاغانی جیسے بدنام اور رسوا کن نمونے سے بے نیاز کر سکتا ہے، اسی طرح حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ جو صحاح میں تفصیل سے موجود ہے، انھوں نے اپنی کہانی اپنی زبانی، اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ احساسات اور انسانی شعور کی تعبیر شاید ہی کوئی کامیاب ادیب اس طرح کر سکے، خود نوشت سوانح حیات میں جو ادبی چاشنی اور حقیقت پسندی تلاش کی جاتی ہے وہ سب اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے، آج ۴۱ سال پہلے جب یہ مجموعہ تیار ہوا تھا اس وقت کم لوگوں کی نگاہ اس کی طرف گئی تھی، مگر عربوں کو اللہ تعالیٰ نے جو وراثتی خصوصیات دی ہیں اس میں وسعتِ قلبی و بلند نظری کے ساتھ عدمِ استنکاف بھی ہے یعنی ان کو کسی مفید اور کار آمد بات کے قبول کرنے میں اس لئے عار نہیں محسوس ہوتا کہ وہ ان کے حلقے یا وطن سے باہر کسی نے بتائی ہے، چنانچہ الاستاذ عبد العزیز الرفاعی جو اپنے عہدے کے لحاظ سے صاحب المعالی (اکزیل) اور علمی و ادبی لحاظ سے اس نسل کے ادیبوں کے مربی سمجھے جاتے ہیں انھوں نے اپنی کتاب کعب بن مالک کی سوانح میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ حضرت کعب بن مالک کے شعر کو تو ہم سب جانتے تھے لیکن نثر میں ان کا ادبی مقام کیا تھا یہ ہمیں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی سے پہلی بار معلوم ہوا اور بارہا ان احادیث کے پڑھنے پڑھانے کے باوجود اس امر کی طرف نگاہ نہیں گئی تھی۔

اس سیمینار کا مقصد یہی ہے کہ احادیثِ نبویہ میں ایسے ادب پارے تلاش کئے جائیں، تاریخ اور سوانح کی کتابوں سے، بزرگوں کے ملفوظات و مکتوبات اور مواعظ کا ادبی نظر سے جائزہ لیا جائے اور پورے علمی و دینی سرمایہ کو از سرِ نو کھنگالا جائے اور جہاں جو ادبی ٹکڑے ہیں ان کو علمی و فنی تدریج کے مطابق مرتب کیا جائے، ادب کو اس کا صحیح مقام دیا جائے، جنس و شکم کے تاجروں کی کاوش اور کمیونسٹوں کے پروپیگنڈہ والے لٹریچر کو جو ادب کا نام دے دیا گیا ہے وہ ہماری اس غفلت کا نتیجہ ہے، ادب کی اجارہ داری، خدا بیزار ہاتھوں میں ہو اور حقیقی ادب گوشۂ گمنامی میں پڑا ہو یہ ایک سانحہ ہے، اس صورتِ حال کو بدلنا چاہئے اور ادب کے مفہوم کی تصحیح ہونا چاہئے، یا یوں کہئے کہ ادب کو اس کا صحیح مقام ملنا چاہئے۔

ندوہ کے سیمینار کا یہی مقصد ہے!

حسن البنّا
ایک مثالی شخصیت

یہ مضمون دراصل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا وہ مقدمہ ہے جو آپ نے الاخوان المسلمون کے بانی و محرک اول شیخ حسن البنا شہید علیہ الرحمہ کی کتاب "الدعوة والداعية" (تبلیغ و مبلغ) کے لئے تحریر فرمایا تھا، یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی ہے۔
(اڈیٹر)

شیخ حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مذاکرات الدعوة والداعية" کا پیش لفظ لکھنا میرے لئے بڑے شرف و سعادت کی بات ہے۔ یہ میری نگاہ میں ان مہتم بالشان کاموں میں سے ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہو سکتے ہیں، یہ مقدمہ لکھ کر میں دوسروں سے پہلے اپنے اوپر احسان کر رہا ہوں اور خود مسرت محسوس کرتا ہوں، یہ کتاب دوسری عام کتابوں کی طرح نہیں ہے نہ اس کا مصنف دوسرے عام مصنفین کی طرح ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی ان عام موضوعات سے مختلف ہے جن پر عام طور پر صحافی اور مصنف لکھتے رہتے ہیں۔

مقدمہ نگار ایسی اہم کتاب اور اس کے عظیم مصنف پر لکھتے اور روشنی ڈالتے ہوئے عرصہ تک جھجکتا اور ہچکچاتا رہا اور جب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مزید تاخیر مسلم نوجوانوں، نیز دعوت و اصلاح کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے ایک وقیع علمی و دینی کتاب سے محرومی کا باعث ہوگی، اس لئے میں نے اس پر چند سطریں لکھنے کی جرأت کی۔

اسلام ابدی اور خدا کا پسندیدہ

دین اور امت مسلمہ اس کا شاداب اور سدا بہار درخت ہے، یہ خدائی ترکش ہے کہ نہ اس کے تیر ختم ہوتے ہیں اور نہ نشانہ خطا ہوتا ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس امت میں ایسے مصلحین و مجاہدین خداداد صلاحیتوں سے مالامال، مؤید من اللہ نادرۂ روزگار اور اسلام کے لئے باعث صد افتخار شخصیتیں ہیں، جو ناسازگار حالات مخالف ماحول اور بیم و رجا کی تیرہ و تاریک فضا میں ایک ایسی قوم میں پیدا ہوتی ہیں جو فکری زوال و اضمحلال، روحانی افلاس، ارادہ کی کمزوری، عزم و ہمت کی پستی، اخلاقی فساد، راحت طلبی و عافیت پسندی، ہر قوت و طاقت کے سامنے سپراندازی، اور اصلاح حال سے مایوسی کا شکار ہوتی ہے اس وقت یہ پوری نسل ایک ہی سانچہ میں ڈھلی ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے پریس سے شائع ہونے والی کتاب کا کوئی ایڈیشن ہو کہ جس کے ایک نسخہ کو پڑھ کر باقی سارے نسخوں کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس ماحول و معاشرہ میں نہ کوئی ندرت و جدت ہوتی ہے نہ حوصلہ مندی و عالی ہمتی کا جذبہ اس ماحول میں عام و رائج چیزوں کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی اور نہ عام معیار سے اونچی کوئی چیز نظر آتی ہے پوری زندگی ایک ٹرین کے مانند ہے جس کو ایک ہی انجن کھینچ رہا ہے اور شکم پروری و مادہ پرستی، خود غرضی و مصلحت پرستی، لطف اندوزی و نفع خوری کا انجن ہے، یا مادی قوت اور ہوس اقتدار کا انجن ہے، پوری زندگی ایک ہی کھیل یا ایک ہی ڈرامہ نظر آتی ہے، جو بڑی مہارت و فنکاری کے ساتھ اسٹیج کیا گیا ہو اور انسانیت یا تاریخ اسلام کے اسٹیج پر اس کو بار بار دکھایا جا رہا ہو، اور اس کا ہر ہیرو اپنا پارٹ پوری چابک دستی و سلیقہ مندی کے ساتھ ادا کر رہا ہو اور آخر میں یہ ڈرامہ تماشائیوں کی تالیوں یا مقتولین و مجروحین کی آہ و بکا پر ختم ہو جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پورے عالم عربی خصوصاً مصر میں یہی ڈرامہ اسٹیج ہو رہا تھا، قافلہ رواں دواں تھا زندگی کی ٹرین اپنے محدود مقاصد کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل رہی تھی، ایک ہی طرح کی آوازیں آرہی تھیں ایک ہی راگ الاپا جا رہا تھا کہ پردہ کی آڑ سے اچانک ایک شخص نمودار ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ پرانے ملبہ کی تہہ اور تاریخ کی سلوٹوں سے ایک مرد آہن باہر آجاتا ہے اور اس مطمئن اور غافل قافلہ کو چونکا دیتا ہے جو چند حقیر مقاصد کی حصول یابی کے سوا کچھ نہیں جانتا جس کو اپنی دنیاوی ضروریات اور جسمانی راحت و آرام کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی، پردہ کے پیچھے سے آنے والا یہ شخص قافلہ والوں کو ہاتھ دیتا ہے، ٹرین کے سامنے خطرہ کی جھنڈی ہلاتا ہے۔ اصلاح حال اور انسانیت کے عام رجحان اور اس کے انجام، امت مسلمہ کے مقام اور اس کی اصل ذمہ داری کے بارے میں از سر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اس امت کو اس کا پیغام یاد دلاتا ہے، وہ بگڑے ہوئے حالات، اخلاقی پستی، گمراہ کن عقائد، جاہلی رسوم و عادات، شکم پروری و ہوس پرستی اور قوت و طاقت کے سامنے سرافگندگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، وہ ایک صاف ستھری زندگی، ایک نیک چلن اور انصاف پسند معاشرہ اور نئے و پختہ ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایسے اسلام کی دعوت دیتا ہے جس کی جڑیں مضبوط اور زندگی کے تمام شعبوں میں پیوست ہوں۔ یہ شیر دل بڑی بلندی سے عقابی روح کے ساتھ ایسی بلند و گونجتی ہوئی آواز لگاتا ہے کہ قافلہ میں کھلبلی مچ جاتی ہے، اس سے جذبات و احساسات میں ایسا کیف و سرور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو نظر انداز کرکے اور اس کو ناقابل التفات سمجھ کر اپنی رفتار کا جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا، کچھ لوگ گوش برآواز ہوتے ہیں، کچھ سمجھتے ہیں پھر آواز لگانے والے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں تھوڑا ہی وقت گذرتا ہے کہ قافلہ والوں کی بڑی تعداد اس کے ارد گرد جمع ہو جاتی ہے۔ یہ داعی اس مجموعہ سے ایک نیا قافلہ تیار کرتا ہے اور پھر یہ قافلہ اس کی دل لگتی باتوں پر سرمست و سرشار ہو کر، خدا پر بھروسہ و اعتماد کرکے بنام خدا سفر شروع کرتا ہے ایسے ماحول و معاشرہ کے خلاف آواز بلند کرنے والے ان داعیوں کی زندگی ایسی درخشاں و تابناک ہے کہ اس سے دعوت و اصلاح کی تاریخ میں چار چاند لگ جاتے ہیں، یہ داعیان اسلام کا وہ قافلہ ہے جس سے تاریخ اسلام کا کوئی عہد کبھی خالی نہیں رہا۔

اس کتاب کا مصنف جس کا مقدمہ لکھنے کی مجھے سعادت حاصل ہو رہی ہے ان شخصیتوں میں سے ہے جنھیں دست قدرت بناتا و سنوارتا ہے، اور خدائی تربیت اسے پروان چڑھاتی ہے۔ پھر صحیح وقت اور صحیح جگہ پر اس کو کھڑا کر دیتی ہے، نگر صالح اور قلب سلیم رکھنے والا جو شخص بھی تعصب سے بلند ہو کر اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ یہ شخص خداداد صلاحیتوں سے مالامال ہے، وہ کسی خاص ماحول یا درسگاہ، تاریخ اور زمانہ، یا محنت و کد و کاوش، یا مشق و تجربہ کی پیداوار نہیں۔ بلکہ وہ توفیق خداوندی، حکمت ربانی اور اس دین کے ساتھ اس کی عنایت کی پیداوار ہے، وہ ایسا ہونہار پودا ہے جس کی نگہداشت کسی بڑے کام اور بڑی امید کے لئے کی جاتی ہے جہاں اس کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔

جو شخص بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق وسطیٰ اور خاص طور سے مصر کے حالات سے واقف ہوا اور عالم اسلام کا یہ اہم اور مرکزی حصہ عقیدہ و جذبات، اخلاق و معاشرت، عزم و ارادہ اور جسم و قلب کی جس کمزوری کا شکار تھا اس پر اس کی نظر ہو، ممالیک (مصر کا حاکم خاندان) ترکوں اور خدیو خاندان کے دور حکومت نے جو اثرات اس پر چھوڑے تھے پھر اس میں برطانوی سامراجیوں نے جو اضافہ کیا تھا اور مغربی تمدن اور موجودہ غیر دینی تعلیم اور مفاد پرست ذہنیت رکھنے

والی سیاسی پارٹی بندی نے جو ذہن تیار کیا تھا وہ بھی اس کی نگاہ کے سامنے ہو۔

اس عہد کے علماء کی کمزوری اور قوت مادیت کے سامنے ان کی سرافگندگی پر بھی نظر ہو جس نے اس میں مزید نزاکت پیدا کر دی تھی، ان علماء میں سے اکثر امامت و رہنمائی کا منصب چھوڑ چکے تھے اور دعوت و ارشاد اور دعوت و ارشاد اور جہاد و مقابلہ کے میدان کو خیرباد کہہ کے حالات کی رو میں بہہ رہے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آواز پست ہو چکی تھی، بے حیائی و بے راہ روی اور الحاد و دہریت کے داعی سرگرم عمل تھے، مقبول و کثیر الاشاعت اخبارات و رسائل نے فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والی دعوتوں اور تخریب پسند تحریکوں کے لئے اپنا دامن وسیع کر رکھا تھا، یہ اخبارات و رسائل دین اور دینی قدروں، اخلاق اور اس کے اصولوں کا مذاق اڑا رہے تھے، بلاد عربیہ عموماً اور مصر خصوصاً سطحیت پسندی، ضعف و انحطاط، جذباتیت و اخلاقی انارکی اور روحانی زوال کی آخری منزل کو پہونچ چکا تھا۔

ان ملکوں کے یہ شب و روز جس شخص کے علم میں ہوں پھر وہ ان کی تصویر مصر سے نکلنے والے "الاہرام" "المقطم" "الھلال" اور "المصور" کے آئینہ میں دیکھنے پھر ان کتابوں میں اس کا مشاہدہ کرے جو مصری ادبا و صحافی پیش کر رہے تھے۔ وہ ادبا و صحافی جن پر مصری نوجوان فریفتہ اور جن کا انکے دل و دماغ پر جادو تھا۔ پھر وہ شخص اس پوری صورت حال کا صحیح خد و خال اور پورا عکس مصر کی پر مسرت تقریبوں اور جشن کی محفلوں اور مجلسوں میں دیکھے، نوجوانوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے ذوق و رجحان کا ان کی محفلوں اور جلسوں میں مشاہدہ کرکے، وہ اسکندریہ اور اس کے ساحل کے حیا سوز مناظر دیکھے، اس نے اسکاوٹوں کے ساتھ کچھ وقت گذارا ہو۔ کھیل و ورزش کے میدانوں میں رہا ہو، سینما گھروں میں مقامی و بیرونی فلموں کو دیکھا ہو۔ ان مخرب اخلاق افسانوں کو پڑھا ہو جو مصری پریس سے سیلاب کی طرح ابل رہے تھے، اور نوجوان ان پر پروانوں کی طرح گرتے تھے۔ اس نے زندگی کے میدان میں لوگوں سے گھل مل کر وقت گذارا ہو، وہاں پیش آنے والی چیزوں کو دیکھا ہو زندگی سے الگ تھلگ رہ کر خیالی دنیا میں وقت گذارنے والا نہ ہو تو اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ مسلمان ان پر آشوب گھڑیوں میں کیسی زبوں حالی کا شکار تھے اور عالم اسلام کے اس اہم خطہ میں جس کو عالم عربی کا قائد اور رہنما ہونا چاہیئے تھا جو صدیوں سے اسلام کے لئے سینہ سپر اور علوم اسلامیہ کا مرکز رہا۔ جس نے ہمیشہ عالم عربی کی مدد کی تھی اور اس کو سہارا دیا تھا اور اسلامی تاریخ کی نازک و مشکل ترین گھڑیوں میں اس کو بچایا تھا، جس میں سب سے بڑا و پرانا اسلامی و ثقافتی مرکز "جامع ازہر" اب بھی موجود ہے دعوت اسلامی کس زبوں حالی کا شکار تھی۔

اس پر آشوب دور کو کتابوں کے ذریعہ نہیں بلکہ قریب رہ کر دیکھا ہو وہی اس شخصیت کی عظمت و انفرادیت کو سمجھ سکتا ہے، جو یکایک پردہ کے پیچھے سے باہر آگئی اور پہلے مصر پھر پورے عالم عربی کو اپنی دعوت و تربیت، جہاد اور طاقتور شخصیت کے ذریعہ اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس رجل رشید اور فرزند میں ایسی قوتیں و صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں جو انسانی نفسیات اور علم الاخلاق کے ماہرین اور متعدد نقاد و مؤرخین کے نزدیک متضاد تھیں۔ بے مثال و تابان عقل اعلیٰ درجہ کی فہم و ذکاوت، ابلتا ہوا جوش و ولولہ، ایمان و یقین سے لبریز دل اقوی روحانیت، فصیح و بلیغ زبان، انفرادی زندگی میں غلو و تقشف سے پاک زہد و قناعت، حوصلہ مندی و عالی ہمتی، جوش و شوق فراواں سے بھرپور دل، بلند پرواز و عقابی روح رکھنے والی ہمت، سحر آفریں دوربین نگاہ، اپنی دعوت کی روح و مزاج کی حفاظت کا اہتمام ذاتی معاملات میں حد درجہ تواضع و خاکساری اور اقبال کے اس شعر کا صحیح مصداق ؎

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

بڑا خوش بیان بہت محبوب اور ہر دل عزیز تھے بہت سے لوگوں نے بیان کیا کہ وہ روشنی کے ہلکے پرتو کی طرح تھے جس میں نہ ناگواری کا تیزی ہوتی ہے نہ سایہ و تاریکی۔

ان اعلیٰ صفات و خداداد صلاحیتوں نے ایک ایسی دینی و اجتماعی قیادت کی تشکیل میں ان کی مدد کی جس سے زیادہ مؤثر و عمیق اور نتیجہ خیز دینی و سیاسی قیادت مدت دراز سے عالم عربی میں وجود میں نہیں آئی تھی ان صفات نے ایک ایسی دینی اسلامی تحریک پیدا کر دی جس سے زیادہ ہمہ گیر و فعال تحریک خصوصاً عرب ممالک میں عرصہ سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ یوں تو قدرتی صلاحیتوں سے مالامال یہ داعی جامع کمالات تھا، مگر دو صفتیں اس میں ایسی تھیں جو وہ بہت کم داعیوں، مصلحین اور قائدین میں پائی جاتی ہیں۔

پہلی صفت اپنی دعوت و تحریک سے غیر معمولی شغف اور اس پر کامل اطمینان و انشراح اور اس کے لئے پوری فنائیت اور اپنی ساری صلاحیتوں و توانائیوں، وسائل و طاقتوں کے ساتھ اس میں ہمہ تن مشغول رہنا ان داعیوں اور قائدین کے لئے جن سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لیتا ہے اور عمومی فائدہ پہونچاتا ہے یہ اہم اور بنیادی شرط ہے۔

ان کی دوسری اہم خصوصیت و صفت تربیت و مردم سازی کے کام میں انکی حیرت انگیز کامیابی ہے، انھوں نے ایک نئی نسل تیار کی، وہ ایک پوری قوم کے مربی تھے۔ وہ ایک علمی، فکری اور اخلاقی مکتبۂ فکر کے بانی تھے۔ پڑھے لکھے لوگوں اور اہل منصب میں جو بھی ان کے ساتھ کچھ دن رہا ان کے فکر و رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنے ہم نشینوں پر ان کا اثر ایسا گہرا تھا کہ عرصہ گذر جانے اور طرح طرح کے انقلابات و تغیرات پیش آنے کے باوجود بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، یہ اثر ایسا شعار و علامت بن گیا ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی کے باوجود وہ اسی سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کا افسوس ہے کہ مصر یا حرمین میں مجھے ان سے ملاقات کی سعادت نہ حاصل ہو سکی۔ پہلا سال جس میں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے حج و زیارت مقدر فرمائی تھی اور پہلی بار ہندوستان سے باہر نکلا تھا، وہ ۱۹۴۷ء تھا جس میں شیخ حسن البنا حجاز مقدس تشریف نہ لائے تھے۔ بلکہ وہ اس سال مصر سے باہر نہیں نکلے تھے، حالانکہ کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت و تحریک کے لئے رفقاء کے ساتھ حج کے موقع پر حجاز نہ آتے ہوں اور اپنی دعوت کو پھیلانے اور حج کے لئے باہر سے آئے ہوئے وفود سے ملنے کی خاص کوشش نہ کرتے ہوں۔

حجاز میں مجھے انکے بعض شاگردوں اور کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا اور میں نے ان کے اندر ایک زبردست قائد و مربی کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جب ۱۹۵۱ء میں مجھے مصر جانے کا موقع ملا تو وہ جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ ان کی عمر ابھی صرف بیالیس سال تھی۔ اس میں شک نہیں کہ انکی شہادت نے لاکھوں مسلمانوں کو سوگوار و دل گرفتہ بنا دیا اور عالم اسلام اس تاریخ ساز شخصیت سے محروم ہو گیا، ان سے ملاقات نہ ہونے کا غم ہمیشہ رہے گا۔ تاہم مصر میں مجھے ان کے شاگردوں سے ملنے کا اچھی طرح موقع ملا اور انکے درمیان میں ایک فرد خاندان کی طرح رہا، مصر کے زمانۂ قیام میں میں نے ان کے والد بزرگوار شیخ عبدالرحمٰن البنا سے ملاقات کی اور ان سے شیخ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں گرانقدر معلومات حاصل کیں اور پھر اپنی کتاب "شرق اوسط کی ڈائری" میں اس ملاقات کا حال اور یہ قیمتی معلومات لکھیں۔ میں ان کے رفقاء اور ارکان جماعت سے بھی ملا اور ان ملاقاتوں اور معلومات سے اس دعوت کے قائد اور اس مکتب فکر کے بانی کی پوری تصویر میرے سامنے آگئی اور مجھے یقین ہے کہ سچی اور مطابق حال تصویر ہے۔

مصر کے اسی سفر میں ان کی یہ کتاب "مذاکرات الدعوة والداعية" میرے ہاتھ لگی ان کی شخصیت و دعوت کو سمجھنے کے لئے میں نے اس کتاب کو ان کی ایک بنیادی کتاب اور ان کی شخصیت کی سب سے بڑی کلید پایا، اس کتاب کو پڑھنے والے ہر شخص کو ان کی عظمت و طاقت کے سرچشمہ، ان کی کامیابی اور دلوں پر ان کے اثر و نفوذ کے اسباب کا پتہ بآسانی لگ جائے گا۔

اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ان کی طاقت و قوت کا اصل سرچشمہ فطرت سلیم، دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی، دینی غیرت و حمیت، اسلام کے لئے اضطراب و بے چینی، اس زمانے کے فاسد ماحول پر ان کی بے چینی و تشویش، اخلاص و للہیت، عبادات کا ذوق و شوق، اور دل کے تاریخ کو ذکر و دعا، توبہ و استغفار اور آہ سحرگاہی کے سلسل

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مکتوب قاہرہ

مکہ کی اسلامی چوٹی کانفرنس

جس کا مذاق اڑا کر اس کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی

مکہ مکرمہ اور طائف میں ہونے والی اسلامی چوٹی کانفرنس کو ایک عرصہ گذر چکا ہے اور اس پر مخالف و موافق بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، بلکہ موافقت میں کم اور مخالفت میں زیادہ اور بہت زیادہ۔ اس قدر کہ اس کی صحیح صورت دنیا کے سامنے آسکی اور نہ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکا اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت ہی سے مسلمانوں کی اہم شخصیتوں کی غلط تصویر پیش کرنا، ان کے اہم اجتماعات کو ناکام ثابت کرنا اور اہم فیصلوں میں کیڑے نکالنا عالمی صحافت اور ذرایع ابلاغ کا معمول رہا ہے اور خاص طور سے اگر کوئی شخصیت آزادانہ اپنی عقل استعمال کرتی ہو یا اجتماعات اور اقدامات میں "بڑوں" کے اشاروں یا مشوروں کے بغیر اپنی مشکلات و مسائل پر غور و فکر اور حل کی کوشش کی گئی ہو۔ عالمی صحافت کے اس طرز عمل کا ایک اہم شکار ترکی کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید تھے۔ مکہ کانفرنس بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کانفرنس پر ہونے والی تنقیدیں ہی اس کی اہمیت کی دلیل ہیں۔

مؤتمر اسلامی جس کی یہ تیسری چوٹی کانفرنس مکہ اور طائف میں منعقد ہوئی تھی کبھی تنقید و تضحیک سے محفوظ نہیں ہو سکی۔ دنیا کی بڑی طاقتیں اور تبعین کا حلقہ مسلمانوں اور مسلم ممالک کی کسی سنجیدہ کوشش یا سرگرمی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکا جو ممالک سلطنت عثمانیہ کے ترکہ پر ابتک جی رہے ہیں اور جن کے لئے عثمانیوں کی تباہی نے سربلندی کا موقع فراہم کیا ہے ان کے لئے مسلم ممالک کی کوئی بھی اجتماعی یا انفرادی سرگرمی برداشت کر لینا بڑا مشکل ہے چنانچہ اسی حلقے نے اس صدی کی چھٹی دہائی ہی میں مؤتمر اسلامی پر معاہدہ بغداد کی طرح کا ایک "اسلامی معاہدہ" کی تشکیل کا اتہام لگایا گیا تھا۔ اسی حلقے نے مکہ کانفرنس پر ہونے والے اخراجات کی بہت شہرت دی۔ یہ دراصل ایک پھبتی تھی جسے مغربی پریس نے اڑا اور اسے اتنی شہرت دی کہ جیسے کانفرنس میں اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر بات تھی ہی نہیں۔ اور بعضوں نے (مثلاً امریکی ہفت روزہ ٹائم) تو اس کا نام ہی "۵۰۰ ملین ڈالر کی کانفرنس" رکھ دیا اور عربوں میں بھی کانفرنس سے خارج ممالک کے اخبارات کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ لیکن یہ لوگ یہ بھول گئے کہ سربراہان ممالک کے غیر ملکی دوروں اور تقریروں کو مصنوعی سیارہ کے ذریعہ زندہ نشر کرنے پر کتنا خرچ آتا ہے، یا ٹوکیو یا ماسکو اولمپک کھیلوں کے انتظام پر کتنا خرچ آیا تھا۔ امریکہ کی صرف ایک ٹی۔ وی کمپنی نے ماسکو اولمپک کھیلوں کو نشر کرنے کے حقوق دو سو ملین ڈالر میں خریدا تھا، امریکی صدر کارٹر کا دورۂ ہند، اس کے لئے حفاظتی انتظامات اور اخراجات ابھی تک اخبار بین بھولے نہیں ہوں گے۔

مکہ کانفرنس میں ۳۸ اسلامی ممالک نے شرکت کی، اس میں سربراہان ممالک، ان کے محافظین، وفود کے ممبران اور صحافیوں کو ملا کر تقریباً دس ہزار آدمی جمع ہوئے۔ کانفرنس کے لئے ہال نیا بنایا گیا جو اقوام متحدہ کے کانفرنس ہال کے مقابلہ کا کہا جاتا ہے۔ وفود کو ٹھہرانے کے لئے ۱۸ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ سعودیہ جیسے ابھرتے ہوئے ملک کے لئے جسے مذہبی مرکزیت کے ساتھ اقتصادی اہمیت حاصل ہو چکی ہے اور سیاسی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اجتماعات کے لئے مستقل انتظامات ضروری تھے۔ یہ چیزیں انہی لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں جنھیں سعودیہ کی اہمیت اور عالم اسلام کی بیداری سے اپنی اہمیت خطرہ میں نظر آتی ہے۔ آج کی دنیا میں جہاں لذت گوش و نگاہ کے لئے ملین ملین خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح اڑ جاتے ہیں۔ اگر سعودی عرب نے مؤتمر اسلامی کے اجتماع کے لئے ۵۰۰ ملین ڈالر خرچ کئے تو یہ نہ صرف جائز درست بلکہ مفید اور ضروری تھا۔

کانفرنس میں مقامی اور عرب صحافیوں کے علاوہ ۳۰۰ (تین سو) عالمی صحافت کے نمائندے شریک ہوئے، لیکن ایک قابل توجہ بات یہ تھی کہ ان نمائندوں میں "نامہ نگاروں" کی تعداد بہت کم تھی اور غالب اکثریت "تبصرہ نگاروں" کی تھی، پتہ نہیں یہ محض اتفاق تھا یا مقصد یہ تھا کہ کانفرنس کی خبریں سیدھے سادے انداز میں دنیا کو نہ پہنچ سکیں بلکہ مبصرین کی باریک بین نگاہوں سے چھن کر اور ضروری کاٹ چھانٹ اور حاشیہ آرائی کے بعد پہنچیں۔ اور ہوا بھی کہ عام اخبار بینوں کی نظر میں "۵۰۰ ملین" کی کانفرنس نقطہائے نظر کے تضاد اور اختلافات کا شکار ہو گئی۔

لیکن یہ تبصرہ آجکل دنیا کے کسی بھی اجتماع پر کیا جا سکتا ہے۔ جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل کے اجتماعات، ان کے فیصلے اور قرار دادوں کا حشر ہمارے سامنے ہے لیکن اس کو چھوڑ دیں کیونکہ چند بڑوں نے اپنی تفریح طبع اور پریشان مصیبت زدہ چھوٹوں کے لئے دل کا غبار نکالنے کا سامان فراہم کیا ہے اس سے کمتر سطح پر دیکھتے ہیں امریکہ اپنی ساری فوجی، اقتصادی اور سیاسی وزن کے باوجود افغانستان میں مداخلت کے موقع پر روس کے خلاف معاہدہ وقیانوس کے ممالک سے صرف بیانات صادر کرانے میں کامیاب ہو سکا، تجارتی بائیکاٹ تو کیا اولمپک کھیلوں کے مقاطعہ پر بھی اتفاق نہیں حاصل کر سکا، دوسری تازہ ترین مثال نئی دہلی میں ہونے والی غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس ہے جس میں ہندوستانی وفد کی کوششیں اس پر صرف ہوئیں کہ اجتماع انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ اسلامی ممالک بھی ان تمام سیاسی اور اقتصادی تضادات کا شکار ہیں جن کا (مثال کے طور پر) غیر جانبدار ممالک۔ ان حالات میں ان تمام ممالک کو جمع کر کے مختلف اور متنوع مسائل میں نقطۂ اتفاق تلاش کر لینا کچھ اہمیت نہیں رکھتا اور اس کامیابی میں میزبان ملک کا کردار سب سے اہم ہے۔ یہ بات تقریباً تمام مبصرین نے نوٹ کی۔ کسی نے اطمینان و مسرت کے ساتھ اور کسی نے تشویش اور فکرمندی کے ساتھ۔ کہ ملک خالد اجتماع کا رمز بن گئے تھے اور امیر فہد کانفرنس کے دماغ تو نوجوان شہزادہ سعود الفیصل وزیر خارجہ اس کانفرنس کا دھڑکتا ہوا دل تھے یا اس پوری مشینری کے ڈائنمو اور اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کورٹ والڈ ہائم کی شرکت نے کانفرنس اور سعودی عرب کے وزن و وقار میں مزید اضافہ کر دیا۔

ترتیب کے اعتبار سے یہ کانفرنس مؤتمر اسلامی کی تیسری کانفرنس تھی لیکن اس میں غور کرنے والے مسائل مناقشات اور نتائج کے اعتبار سے یہ اپنے انداز کی پہلی کانفرنس تھی۔ اس سے پہلے کی دو کانفرنسیں وقتی حادثات اور حالات کے دباؤ کا نتیجہ تھیں اور انھیں میں وہی وقتی مسائل زیر بحث آئے تھے لیکن کانفرنس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مستقبل کے لئے لائحۂ عمل متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس اعتبار سے پہلی کانفرنسیں اگر اجتماع ختم ہو گئی تھیں تو یہ کہ کانفرنس اس کے بعد شروع ہوتی ہے اور سعودیہ نے پرزور کوشش کی کہ شرکائے اجتماع میں کم سے کم نقطۂ اتفاق تلاش کر لیا جائے اور یہ مساعی جمیلہ ناکام نہیں ہوئیں، فلسطین اور بیت المقدس کی آزادی یہ سب کا اتفاق تھا۔ اور اسی وجہ سے کانفرنس کا نام بھی "قدس و فلسطین کانفرنس" رکھ دیا گیا۔ مستقبل کے لئے لائحۂ عمل متعین کیا گیا اور اسے "میثاق مکہ" کا نام دیا گیا جس کی تفصیلات اخبارات میں آ چکی ہیں۔

کانفرنس کی اہم بات یہ تھی کہ "اسلامی بیداری" کا سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا۔ یہ بیداری کوئی نئی نہیں مسلم عوام میں دینی شعور ایک عرصہ سے بیدار ہو رہا ہے۔ روشن خیالی، تہذیب و تمدن، جدت اور زمانہ شناسی جیسے ناموں کے ساتھ مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی جو کوششیں لمبی مدت سے ہو رہی تھیں سب ناکام ہو چکی ہیں اور مسلمان تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں اور سمجھ بوجھ کر اور یقین و ایمان کے ساتھ لوٹ رہے ہیں۔ چند سال قبل صورت یہ تھی کہ مسجدوں یا دینی اجتماعات میں بوڑھے نظر آتے تھے اور نوجوان خال خال۔ اور اب صورت برعکس ہے مسجدوں اور دینی محفلوں میں نوجوانوں کی کثرت ہے اور عام لوگوں ہی کی نہیں بلکہ پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ نوجوان۔ جو لوگ چند سال پہلے آزاد روی یا کبھی کبھی گمراہی کا انسان شکار تھے آج اسلامی دعوت کا علم سنبھالے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور اسلام کی عزت و سربلندی کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال پورے عالم اسلام میں عام ہے اور نوجوانوں کی ان کوششوں کو کہیں انتہا پسندی کا نام دیا جاتا ہے کہیں تعصب کا اور کہیں کچھ اور، لیکن مکہ کانفرنس نے امیر فہد کی زبانی اسے سرکاری طور پر تسلیم کیا انھوں نے اسے "صحوۃ اسلامیۃ" کا نام دیا اور اگرچہ انھوں نے وضاحت کی کہ یہ "بیداری" کسی کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات کی طرف رجوع ہے اور اپنی داخلی قوتوں کو بروئے کار لا کر بہتر مستقبل کی طرف قدم اٹھانے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن یہ کوئی پیشین گوئی نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اسے نہ مغرب برداشت کرے گا نہ مشرق اور ہم نہیں سمجھتے کہ یہ حقیقت امیر فہد اور ان کے ساتھ شرکاء کے کانفرنس کی نظروں سے اوجھل ہوگی۔

ایک اور اہم بات جسے تقریباً تمام مغربی ذرایع ابلاغ نے نظر انداز کیا ہے وہ ہے کانفرنس میں مسیحیوں کی شرکت۔ اسی وجہ سے کانفرنس کا بہترین اور مقدس ترین مقام مکہ مکرمہ میں صرف افتتاحی اجلاس ہوا اور حرم شریف میں طواف اور دعاؤں کے بعد لوگ طائف منتقل ہو گئے ان میں الیاس سرکیس جیسے سربراہان مملکت ہی نہیں بلکہ مشرقی ارتھوڈکس کلیسا کا وفد بھی تھا۔

کانفرنس میں زیر بحث سب سے نمایاں مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کا تھا اور غالباً پہلی دفعہ صراحت کے ساتھ بیت المقدس کو بین الاقوامی نگرانی میں دینے کی مخالفت کی گئی اور اسے عربوں کو واپس دلانے پر زور دیا گیا۔ ویٹیکان کی طرف سے بیت المقدس کے سلسلہ میں کچھ تجاویز پیش کی گئی تھیں جن کا حاصل یہ تھا کہ اگر موجودہ صورت حال میں بیت المقدس پر عربوں کا اقتدار واپس نہیں لایا جا سکتا تو درمیانی حل کے طور پر اقوام متحدہ کی نگرانی میں دیدیا جائے لیکن سعودی عرب شاہ فیصل مرحوم کے زمانہ ہی سے اس تجویز کے خلاف ہے اور ویٹیکان اور مکہ کے درمیان دینی یا سیاسی محاذ آرائی سے بچنے کے لئے امیر فہد کے ذریعہ عیسائی فریق کو بھی قدس کی آزادی کی جد وجہد میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ کیونکہ "بیت المقدس صرف مسلمانوں ہی کے لئے اہم نہیں" اور ارتھوڈکس کے رومی مشرقی کلیسا کے سربراہ اگناطیوس ہزیم ممتاز مذہبی شخصیتوں کے ساتھ شریک ہوئے۔ اسی مسیحی وفد نے فلسطینی سربراہ یاسر عرفات کے جہاز پر ان کے ساتھ سفر کیا اور پیٹریارک اگناطیوس نے کانفرنس کو خطاب بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تجویز یہ تھی کہ مشہور پادری کابوچی یاسر عرفات کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہوں لیکن ان کی شرکت ویٹیکان کے لئے سیاسی مسائل پیدا کر سکتی تھی اس لئے ارتھوڈکس پادریوں اور لبنان کے عیسائی صدر کو ترجیح دی گئی۔

یہ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ محض خانہ پری کے لئے ایک عیسائی وفد کو بھی شریک کر لیا گیا ہو بلکہ اس کی جڑیں کافی گہری ہیں اور باخبر لوگوں کا کہنا ہے کہ "بکرکی" اور "دیمان" کے مارونی کلیسا میں بڑے قیمتی خطوط محفوظ ہیں جن سے سعودی عرب اور ویٹیکان کو قریب لانے کے لئے مارونی کلیسا کی کوششوں پر روشنی پڑتی ہے اور ان میں سب سے اہم کوشش یہ تھی کہ مرحوم ملک فیصل اور پاپا پولس ششم کے درمیان بیت المقدس کے موضوع پر گفتگو ہو سکے۔ یہ کوششیں مسجد اقصیٰ کی آتشزنی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں اور مقصد یہ تھا کہ ملک فیصل اور پاپا میں ملاقات کے انتظامات کرائے جائیں اور بات کافی حد تک آگے بڑھ چکی تھی لیکن بعض غیر اہم اسباب کی وجہ سے یہ تاریخی ملاقات نہیں ہو سکی۔ پاپا کا خیال تھا کہ وہ حضرت مسیح کے وارث کیتھولک فرقے کے امام اور کلیسا کے نگراں ہیں اور یہ خدا کا گھر ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اس میں آنے کے لئے رسمی دعوت نامہ نہیں بھیجے سکتے تو ملک فیصل نے کہا کہ وہ مسلمانوں کے امام اور حرمین کے محافظ ہیں اور بغیر رسمی دعوت کے ویٹیکان نہیں جا سکتے۔ اس طرح یہ تاریخی ملاقات تو ظاہری کارروائیوں کی نذر ہو گئیں لیکن ان دونوں میں قربت کی کوششیں جاری رہیں۔ ملک نے دیکھا کہ بیت المقدس میں تینوں آسمانی مذاہب کے مقدس مقامات موجود ہیں لیکن یہودی دوسرے مذاہب کے اثرات کو ختم کر کے شہر کو پوری طرح یہودیانا چاہتے ہیں اور مسجد اقصیٰ کی آتشزنی اس کی سب سے واضح مثال تھی، اس شہر کو تباہی سے بچانے اور یہود کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے ملک فیصل مسیحیوں کے تعاون چاہتے تھے اور ان کا سب سے بڑا مرکز ویٹیکان ہے، اور یورپی ممالک پر اس کا اثر بھی ہے، پھر پاپا الحاد کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکی صدر کینیڈی اور فرانسیسی صدر ڈیگال سے ملاقات بھی کر چکے تھے، پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ پاپا بیت المقدس کو بچانے کے لئے ملک فیصل سے ملاقات نہ کرتے، بہرحال گفتگو جاری رہی مسلم علماء کا ایک وفد ملک فیصل ہی کے اشارہ سے ویٹیکان گیا جس کی تجویز پاپا ہی نے رکھی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں مذاہب کے سربراہوں کی ملاقات اخیر میں اٹلی کے صدر کے گرمائی قیام گاہ پر طے ہو گئی تھی، دونوں کے نام دعوت نامے جاری ہو چکے تھے ملاقات کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور مشترکہ بیان کا مسودہ بھی تیار ہو چکا تھا لیکن شاید قدرت کو یہ ملاقات منظور نہیں تھی اور ملک فیصل شہید کر دئے گئے۔

مکہ کانفرنس سے چند ہفتے پہلے تاریخ میں پہلی بار ایک سعودی ذمہ دار ویٹیکان سٹی میں داخل ہوا۔ یہ ملک فیصل کے صاحبزادہ شہزادہ سعود الفیصل سعودی وزیر خارجہ تھے، اور پاپائے روم اور نوجوان وزیر خارجہ میں گفتگو کا موضوع اس بار بھی وہی بیت المقدس تھا اسی مسئلہ میں مغربی مسیحی نقطۂ نظر اور سعودی نقطۂ نظر میں فرق ہے، مغرب اس مسئلہ کو صرف تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور تینوں مذاہب کے مقدسات کے معتقدوں کی تحدید اور ان پر سب کے حقوق کو کافی سمجھتا ہے، اور باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ امیر سعود الفیصل نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا کہ بیت المقدس کی اہمیت صرف وہاں کی تاریخی عمارتوں اور در و دیوار ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے باشندے بھی ہیں۔ اسرائیل اس کے مسلمان اور مسیحی تمام اصل باشندوں کو نکال رہا ہے اور یہ تجویز پیش کر رہا ہے کہ شہر کو بڑی طاقتوں اور اس مسئلہ سے متعلق ممالک کی نگرانی میں دیدیا جائے لیکن باشندوں کی واپسی سے منکر ہے۔ اور عبادت گذاروں کے بغیر ان عبادت گاہوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

ممکن ہے اس ملاقات کا جوڑ مکہ کانفرنس سے ملا دیا جائے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے صحیح بات یہ ہے کہ سعودیہ کو پتہ چلا کہ ویٹیکان فلسطین کے بارہ میں اپنے افکار کا خلاصہ امریکہ کے نئے صدر ریگن کو بھیجنا چاہتا ہے اور امریکی صدر اس میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں خاص طور سے اس لئے بھی کہ امریکی کلیسا نے ان کو وہائٹ ہاؤس تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس لئے پاپائے روم کے خط کی بڑی اہمیت ہوگی اس موقعہ پر سعودی عرب اور ویٹیکان میں تبادلۂ خیال ضروری تھا اس لئے پاپا بھی سعودیہ کا نقطۂ نظر جاننا چاہتے تھے۔ یہ ملاقات کوئی وقتی اور اضطراری نہیں تھی بلکہ سعودی عرب کی بیت المقدس کے متعلق یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ نہ دیا جائے اور اس پالیسی کے اثرات مکہ کانفرنس میں ظاہر تھے۔ سعودیہ، لبنان اور تنظیم آزادی فلسطین پوری کوشش کی کہ کانفرنس میں فرقہ وارانہ رنگ نہ آنے پائے اور غالباً اس لئے بھی امیر فہد نے اسلامی بیداری کی وضاحت کی یہ کسی کے خلاف نہیں ہے۔ یہی صورت حال قریب قریب مؤتمر کی لاہور کانفرنس میں بھی تھی جب ملک فیصل نے لبنان کے مسیحی صدر سلیمان فرنجیہ کو مسلم سربراہوں کے سامنے پیش کیا تھا اور اسی لئے سعودیہ ہی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ سنہ ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ میں عربوں کے ترجمان سلیمان فرنجیہ ہوں وہ اس کے ذریعہ اسرائیل کے فرقہ پرستانہ نظریہ کی تردید کرنا چاہتے تھے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس وقت امریکہ میں یہودی وزیر خارجہ کسنجر

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

تبلیغ و دعوت

انسانیت کی مسیحائی

مولانا سید الاعظمی ندوی ——— ترجمہ: عبدالرشید اورنگ آبادی ندوی

اسلام سے ماقبل تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام نے عالمی سطح پر کتنی بڑی خدمت انجام دی، ڈوبتے سفینہ کو ساحل مراد تک پہونچا دیا، روتی بلبلاتی انسانیت کے ظلم و کرب کو ختم کیا اور اسے اعلیٰ مرتبہ تک پہونچایا۔ اسلام نے یہ خدمت ایسے وقت انجام دی جب "انسانیت ظلم و بربریت سے کراہ رہی تھی" ایک خاندان کے گنے چنے افراد پورے مجموعہ انسانی پر اپنا حکم و تسلط جمائے ہوئے تھے اور انسانیت کے ساتھ گدھے اور کتے کا سا برتاؤ کرتے تھے، اور سامان تفریح بناتے تھے، اسلام کا یہ بڑا کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے انسان کو انسان کے ساتھ جینے کا طریقہ سکھایا، مردہ ضمیروں کو بیدار کیا، حق کی آواز بلند کرنا سکھایا اور اس کو رتبہ و مقام دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جلیل القدر تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ماقبل اسلام کی اس صورت حال کی پوری تصویر کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں:-

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پھندے میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسائیوں اور سامان میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کرلی تھی اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے اور فخر کرتے تھے دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہوگئے تھے جو اس سامان آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہوگیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا اگر کسی کے پاس عالیشان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم جنسوں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کرسکتے۔

یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہوگیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی، اور ان کے پورے نظام تمدن میں سرایت کرگیا تھا یہ مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہوگئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کردیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش بہا رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہوسکتی تھی، اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں اور اگر وہ تعمیل کرتے تو جانوروں جیسا سلوک کرتے۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ عجمی تہذیب و ثقافت نے انسان کو اونچ نیچ، گدا و غنی قوی و ضعیف کے دو طبقوں میں بانٹ دیا، کینہ و حسد، بغض و عداوت، عصبیت و قومیت رنگ و نسل کی تفریق کے بیج دلوں میں بو دئے اور دم انسانی اور اس کے عز و شرف کے احساس کو ختم کردیا، نتیجتاً انسان کے خون سے ہولی کھیلی گئی، حرمات کو پامال کیا گیا اور پوری دنیا ظلم و جور، بربریت و شیطانیت کا شکار ہوکر رہ گئی۔ لیکن اسلام نے انسان کی قدر و منزلت کو بڑھا کر بام عروج تک پہونچایا اور دنیا والوں کے سامنے اخوت و مساوات، مواسات و ہمدردی کا حسین گلدستہ پیش کیا اور صاف طور سے یہ اعلان کردیا کہ تمام انسان برابر ہیں کسی انسان کو کسی دوسرے پر ذرا بھی فوقیت نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان انسان کے مساوات کی کھلی دلیل ہے کہ "نہ عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل ہے نہ عجمی کو عربی پر، نہ کالا گورے سے بڑھا ہوا ہے نہ گورا کالے سے صرف تقویٰ ہی انھیں ایک دوسرے پر فائق کرسکتا ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں"۔ اسی طرح قرآن پاک نے اعلان کرتے ہوئے انسان کی حقیقت سے روشناس کرایا،

"یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" (اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو)۔

رنگ و نسل، جنس و مال، قوی و ضعیف کے تمام امتیاز کو یک لخت ختم کرکے تمام انسانوں کو یہ سبق سکھایا کہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہنے ہی میں اس کی فلاح و بہبودی مضمر ہے، اسی طرح اس مظلوم و پریشان حال انسان کو اخوت و محبت، مساوات و رواداری کا سبق یاد دلاتے ہوئے اس کے خون و حرمت کے لحاظ پاس سے بھی واقف کرایا اور یہ بھی بتادیا کہ جاہلیت نے انھیں کس طرح آگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا اور اسلام نے اس میں گرنے سے کس طرح بچالیا۔ انسانیت پر اس کا یہ احسان و انعام نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن پاک اپنے انعامات کو بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہے۔ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا"۔

آج انسانی سوسائٹی پر مادیات کا جو جال پھیلا ہوا ہے اور جہاں دانگ عالم میں اس سے جو شور برپا ہے اس سلسلہ میں اگر ہم فکر و تامل سے کام لیتے ہوئے انسان کی زبوں حالی و خستہ سامانی کے اسباب و دواعی تلاش کریں تو لازمی طور پر مادیت ہی کو اصل سبب قرار دینا ہوگا۔ چنانچہ آج کا متمدن انسان اسی طرح پریشان و حیران ہے جس طرح دور جاہلیت میں تھا اس کی اس پریشانی و بدحالی کے وجوہ و نام بدل گئے ورنہ جہاں تک ظلم و جور، شقاوت و عذاب، تشدد و سرکشی کا سوال ہے وہ آج بھی اسی طرح ہے جیسے زمانۂ اسلام سے ماقبل تھا چاہے وہ تہذیب و ثقافت کے نام پر ہو یا رفاہیت و معیار زندگی کے اعلیٰ ہونے کی بنیاد پر۔

آپ خود دیکھتے ہیں کیا آج کالے و گورے کے درمیان جنگ برپا نہیں ؟ کیا طبقاتی تفاوت آج نہیں پایا جاتا ؟ کیا عیش و نعم میں پلنے والے اور اعلیٰ عہدہ دار کا طبقہ اپنی دولت و مال کی بنیاد پر اتراتا ہوا نظر نہیں آتا ؟ کیا رنگ و خون نسل و خاندان کا امتیاز آج باقی نہیں ؟ کیا کمزور طبقہ کو ایک ادنیٰ غلام کی سی زندگی آج گذارنی نہیں پڑتی ؟ کیا مزدور و پیشہ ور طبقہ ایک لقمہ کے لئے محنت و مشقت برداشت نہیں کرتا ؟ کیا یہ سب روم و فارس کی تہذیب و ثقافت اور طرز معاشرت سے بڑھ کر ہمارے علم و صاحت عقل و فلسفہ کے تمدن و کلچر میں نہیں پایا جاتا ؟ کیا ایک کمزور و ناتواں انسان سے اس کا حق زندگی نہیں چھینا جاتا ؟ کیا اس کو تپتی ہوئی آگ و لوہے پر نہیں لٹایا جاتا ؟ کیا اس کی کھال بکری و اونٹ کی طرح نہیں کھینچی جاتی ؟ اور اس کو ذلیل و رسوا نہیں کیا جاتا ؟ کیا ایک لاڈلے بچے کو اس کی ماں، شوہر کو بیوی اور اولاد

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

شاہان اسلام کی علمی قدردانی

(ڈاکٹر شبیر احمد قادر آبادی ندوی)

مذاہب عالم کی تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ دین و سیاست باہم متحد اور ہمرہ بار رہے ہوں اور دونوں کی عمل داری یکساں طور پر پسندیدہ اور مقبول رہی ہو۔ شاہان وقت نے مذہب کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کردیا ہو اور دین نے اُن کے لئے تحفظ اور پناہ کا کام کیا ہو لیکن دین رحمت اسلام کے زیر سایہ ایسا ہوا ہے بلکہ دین و سیاست کا حسین امتزاج و ارتباط ہی اس کا نمایاں وصف رہا ہے۔ صالح اور حق پرست علماء، خدا ترس اور رعایا پرور حکمرانوں نے دین کی عظمت اور سیاست کی پاکیزگی کی شاندار مثالیں قائم کی ہیں کہ چشم عالم حیرت میں ہے۔

درحقیقت اسلام کی علمی و ایمانی تاریخ جس طرح روشن اور تابناک ہے اسی طرح اس کی سیاسی و عملی زندگی بھی قابل فخر اور عبرتناک ہے۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے بلند پایہ مخلص، اور صاحب نظر علما و مفکرین موجود رہے ہیں، جنھوں نے لوح و قلم کا وقار مستحکم کیا ہے اور کارگاہ علم و عمل کو آبرو دی ہے۔ صدر اول سے لے کر آج تک ایک سرسری نگاہ ڈال جائیے اور مختلف علوم و فنون کو اپنی نظر میں رکھئے۔ آپ کو بے شمار ابو حنیفہؒ اور احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ اور ابن قیم، رازیؒ و غزالیؒ، ابن رشد و فارابی جیسے بے غرض اور بے لوث اہل علم ملیں گے جنھوں نے جاہ و حشم اور منصب و اقتدار سے بے نیاز ہوکر سجادۂ علم و فن کو رونق بخشی اور آنے والی نسلوں کے لئے روح کی بالیدگی اور قلب و جگر کی طہارت کا سامان فراہم کیا۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تو دنیاوی اقتدار کے بڑے سے بڑے اور بلند تر مقام پر فائز ہوسکتا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ عہدے اور منصب انھیں پیش بھی کئے گئے مگر ان بلند پرواز شاہینوں نے ان کی سطحی اور چند روزہ چمک دمک میں الجھنا پسند نہیں کیا بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں اوپر اور اوپر ہی اڑتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ یہ سب اپنے اپنے فنون کے امام ہوئے اور صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی اُن کے نام تاریخ کے طالب علموں کو ازبر ہیں۔

ٹھیک اسی طرح مسلم سلاطین و امراء کی معارف پروری اور اُن کی علماء نوازی کی تاریخ بھی بہت دل گداز ہے، وہ ایسا حسین مرقع ہے جس سے ہمارا ماضی روشن اور حال تابناک ہے جو موجودہ نسل کے لئے اسوہ بھی ہے اور مشعل راہ بھی۔ درحقیقت وہ اس فکر صالح کی تاریخ ہے کہ قیادت، خدمت کے مترادف ہے اور قوم کا سردار صحیح معنوں میں خادم ملت ہے۔ حکومت کا جاہ و جلال اور اقتدار کا نشہ اس کے لئے بے معنیٰ ہے۔ اس کی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ خالق کائنات خوش ہو جائے اور قوم کی فلاح و بہبود کا کوئی کام ہو جائے۔ چنانچہ ایسے مثالی حکمراں اور خدا ترس امراء کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن اِن میں بھی خلفاء راشدین، عمر بن عبدالعزیز، ہارون الرشید، صلاح الدین ایوبی، اسپین کے حکم ثانی اموی وغیرہ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

لیکن دور کیوں جائیے ہمارے وطن عزیز ہندوستان کی تاریخ بھی اس معاملہ میں عالم عرب سے کسی طرح کمتر اور پیچھے نہیں ہے، بلکہ اس سرزمین نے تو ایسے بے شمار سپوتوں کو جنم دیا ہے جن پر اقتدار و اختیار کی تاریخ جتنا بھی فخر کرے کم ہے اور ہندوستان جتنا بھی ناز کرے حق بجانب ہے۔ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، جہانگیر شاہ، شاہجہاں، مظفر حلیم شاہ گجراتی، اور محی الدین اورنگ زیب جیسے باصلاحیت، بلند عزائم اور عظیم الشان حکمرانوں کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے جن کا اُجالا صدیوں پر محیط ہے۔ ان سب ہی حکمرانوں کی ایک خصوصیت رہی ہے کہ ایک طرف یہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے تھے، تخت شاہی پر رونق افروز ہوتے تھے تو دوسری طرف بزرگوں کی جوکھٹوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ علماء کی مجلسوں کے "حاضر باش" ہوتے تھے، ان کے اور مشائخ و علماء کے تعلقات استاد و شاگرد اور مرید و مرشد کے تعلقات ہوتے تھے۔ جن میں بہر حال استاد اور مرشد کو برتری حاصل ہوتی تھی کون نہیں جانتا کہ شاہ وقت شمس الدین التمش اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے پیچھے پیچھے پا پیادہ چلتا اور اُن کی مرضی کا طالب ہوا کرتا تھا۔ باجبروت حکمراں علاء الدین خلجی محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کی ملاقات کا بہر قیمت خواہاں تھا۔ بادشاہ کے خادم خاص حضرت امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) دربار کے ایک وفادار ملازم ضرور تھے لیکن اپنے مرشد نظام الدین اولیاء کی مرضی انھیں زیادہ عزیز تھی۔ تاریخ کی کتابیں جو چاہیں ثبوت پیش کریں اور مورخ جو چاہے تاویل کرے لیکن میرا اپنا ایک خیال ہے وہ یہ کہ سیاست اور مادیت کی طرح روحانیت اور عبدیت کا بھی ایک نظام ہوتا ہے۔ جب بندہ پیکر عمل بن کر غیب کی صدا بن جاتا ہے تو اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے پھر اس میں کارکشائی اور کارفرمائی کی بے پناہ طاقت ودیعت ہو جاتی ہے اور بقول اقبالؔ ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

والا معاملہ ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ایک دور دار السلطنت دہلی پر گذرا ہے کہ جب تخت شاہی پر خلجی و تغلق، لودی و مغل فرماں رواں ہوتے تھے لیکن صحیح معنوں میں حکومت کی مشنری انھیں بزرگوں کی مسیحا نفسی کے زور پر چلتی تھی۔ سلاطین و امراء ان بوریہ نشین شہنشاہوں کی مرضی اور ان کے اشارہ چشم و ابرو کے منتظر رہا کرتے تھے اور دل کا قرب و بعد اور اس کا عدم و وجود ان ہی کی مرضی پر منحصر ہوا کرتا تھا۔

غرض کہ دین و سیاست کے خوش گوار اتحاد اور سلاطین و علماء کے بہتر تعلقات کی بے شمار مثالیں اسلامی ہندوستان میں بھی پائی گئی ہیں، اور ایسے نادر اور دل گداز واقعات پیش آئے ہیں جن سے دوسرے ممالک کی تاریخوں کے صفحات خالی ہیں، یعنی یہاں ایسے سلاطین بھی رہے ہیں جنھوں نے اپنی اولادوں اور اپنے اقتدار سے بڑھ کر علم اور علماء کو فوقیت دی ہے اسی طرح ایسے علماء بھی رہے ہیں جو بقول مورخ ضیاء الدین برنی، رازی و غزالی کے پائے کے تھے جنھوں نے سود و زیاں سے بلند ہوکر حق گوئی و بیباکی کا اعلیٰ معیار قائم کیا، دین کی بے لوث خدمت کی اور خون جگر سے علم و فن کی آبیاری کی۔ ذیل میں اپنی اسی تاریخ کے چند آثار پیش کئے جاتے ہیں جس میں ہمارے لئے عبرت کا بڑا سامان ہے۔

ہندوستان میں ادب حدیث کے ممتاز عالم شیخ علی متقی م ۹۷۵ھ بڑے عابد و زاہد اور انتہائی متقی و پرہیزگار شخص تھے۔ آپ کی تالیف کنز العمال فن حدیث میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ چلپی نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور شیخ ابوالحسن البکری نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "دنیائے علم پر سیوطی کا احسان ہے لیکن خود سیوطی پر شیخ متقی کا احسان ہے" "للسیوطی منۃ علی العلمین وللمتقی منۃ علیہ" (ابجد العلوم ص ۸۹۵)۔

آپ کی جلالت شان اور علو مرتبت کا یہ عالم تھا کہ وضو کے وقت سلطان محمود گجراتی آپ کے ہاتھ اور پیروں پر پانی ڈالتا تھا۔ ترکی سلطان سلیمان بن سلیم بن بایزید بن محمد کو جب آپ کی بزرگی و علمیت کی خبر ہوئی تو اس نے آپ سے دعا کی درخواست کی اور پھر زندگی بھر شیخ سے عقیدتمندانہ رشتہ قائم رکھا۔ (نزہۃ الخواطر ص ۲۴۳)

ملک المحدثین، جمال الدین محمد بن طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) ان ہی نامور استاد کے ناموار شاگرد تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت سے آنکھیں روشن کی تھیں اور وہاں کے علماء و فضلاء سے استفادہ کیا تھا، علم و عمل اور روحانی و قلبی برکتوں سے مالا مال ہوکر وطن تشریف لائے اور اصلاح قوم کا بیڑہ اٹھایا اسی دوران ایک ایسا موقع آیا کہ شیخ نے اپنے سر سے دستار فضیلت اُتار کر رکھ دیا اور عہد کیا کہ جب تک قوم کی اصلاح نہ کر دوں گا تو سر پر نہ رکھوں گا شہنشاہ اکبر کو جب اسکی

خبر ہوئی تو بنفس نفیس تو بنفس نفیس شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ہاتھوں سے آپ کے سر پر عمامہ رکھا اور کہا، اس کام میں ہم آپ کے شریک ہیں۔ دین کی سربلندی ہمیں عزیز ہے۔ "عممہ بیدہ وقال لہ علی ذمتی نصرۃ الدین وکسر الفرقۃ المبتدعۃ"۔

(نزہۃ الخواطر ج ۴ صفحہ ۳۰)

شیخ عبدالنبی گنگوہی م ۹۹۱ھ "سنن الہدیٰ فی متابعۃ المصطفیٰ" کے مولف اور عہد اکبری کے ایک جید عالم تھے۔ بادشاہ اکبر ان کا اس درجہ ادب کرتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے اُن کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ اُن کے گھر جاکر اُن سے حدیث پڑھتا تھا اُنکے فیض صحبت سے اس کی مذہبی وارفتگی یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ مسجد میں خود اذان دیتا تھا اور ثواب کی نیت سے مسجد میں جھاڑو بھی دیتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے سالگرہ کی تقریب میں زعفرانی رنگ کا کپڑا استعمال کیا، شیخ عبدالنبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ سر دربار چھڑی اٹھا کر مار دی، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر ماں سے شکایت کی کہ "شیخ خلوت میں منع کرتے تو کوئی بات نہ تھی دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا"۔ مریم مکانی نے کہا، "بیٹا! دل پر میل نہ لاؤ یہ نجات اخروی کا باعث ہے قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال مُلّا نے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی اور سعادتمند بادشاہ نے اس کو برداشت کیا"۔

{منتخب التواریخ ج ۲ صفحہ ۲۰۴
ماثر الامراء ج ۲ صفحہ ۵۶۰}

(مقام عبرت ہے کہ دنیا پرست علماء کی صحبت نے اسی اکبر کو آخر میں ملحد بنا دیا تھا)۔

لودھی سلاطین میں سکندر م ۹۲۳ھ علم دوستی اور کمال پروری میں شہرۂ آفاق تھا۔ خود بھی عالم تھا اور علماء کا قدردان تھا، اس نے بے شمار علماء کو باہر سے بلاکر ہندوستان میں قیام کی دعوت دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خلوت وجلوت میں ۱۷ علماء اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ محدث دہلوی دور سکندری کی ترتیبوں سے بہت متاثر تھے۔ فرماتے ہیں، "بالحقیقۃ محامد زمان سلطنت آن سلطان سعادت نشان از حد تحریر و تقریر خارج است" (اخبار الاخیار صفحہ ۲۲۴)

ملتان کے شیخ عبداللہ تلنبی م ۹۲۲ھ کا بڑا احترام کرتا تھا اور اُن کے طریقۂ درس وتعلیم کا گویا عاشق تھا اُن کے درس میں اکثر وبیشتر شریک ہوا کرتا تھا، اور اس خیال سے کہ سلسلۂ درس کہیں رُک نہ جائے مدرسہ سے متصل مسجد کے ایک گوشہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا تھا جہاں سے وہ مولانا کی پوری تقریر سنتا رہتا تھا اور فیض حاصل کرتا۔ جب وہ فارغ ہوجاتے تو سلام علیک کہہ کر سامنے آجاتا۔

(نزہۃ الخواطر ج ۴ صفحہ ۲۰۰ بدایونی اول صفحہ ۳۲۲)

اسی بادشاہ کا واقعہ ہے کہ ایک بار مولانا عبداللہ سلطانپوری کے ساتھ کہیں جارہا تھا۔ ایک مست ہاتھی کہیں سے آتا دکھائی دیا۔ سکندر لودی نے اپنے کو آگے اور مولانا عبداللہ سلطان پوری کو پیچھے کردیا، مولانا نے سلطان سے کہا، "کہیں تخت وتاج ایک بادشاہ سے محروم نہ ہوجائے" سلطان نے جواب دیا "تخت وتاج کو تو ایک بادشاہ مل جائے گا لیکن مولانا عبداللہ سلطان پوری پھر نہ پیدا ہوں گے"۔

خیرآباد ہند جونپور، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں علماء وفضلاء کا مرکز تھا اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی م ۸۴۹ھ اس مملکت علم کے بادشاہ تھے اس وقت کے ہندوستان کی علمی بہار اُن ہی کے دم قدم سے قائم تھی۔ ایک بار آپ ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی عیادت کو آیا۔ مزاج پُرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لے کر مولانا کے سر پر پھرا کر یہ دعا مانگی کہ خداوندا یہ بلا اُن سے دور کرکے اس کے بدلہ میں میری جان صدقہ میں قبول فرما۔ آخر دونوں آگے پیچھے ۸۴۴ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

(نزہۃ الخواطر ج ۳ صفحہ ۲)

مفکر اسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علمی وروحانی مقام ومرتبہ سے یہاں کا ہر مسلمان پوری طرح واقف ہے۔ آپ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب کا واقعہ ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کی تصحیح کے سلسلہ میں کچھ دنوں کے لئے عالمگیری دربار سے وابستہ ہوگئے تھے، مگر ان کے مرشد مولانا ابوالقاسم نے یہ وابستگی پسند نہیں کی، اس لئے وہ اس سے علیحدہ ہوگئے، ایک بار عالمگیر نے شوق ملاقات کا پیام ان کے پاس بھیجا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کردیا اور ایک معمولی کاغذ پر جس میں اُن کا جوتا لپٹا ہوا تھا یہ عبارت لکھ کر شہنشاہ ہندوستان کے پاس بھیج دی۔

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت بُرا ہے جو کسی امیر کے آستانے پر ہو حق سبحانہٗ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے، تم کو اس کا بھی قلیل ترین جزء ملا ہے اگر بالفرض اس میں سے مجھے بھی دو گے تو وہ جزء لایتجزیٰ ہوگا اس ٹکڑے کے لئے میں اپنا نام خداوند تعالیٰ کے دفتر سے کیوں کٹواؤں، اہل چشت کے ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے تو حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے"۔

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ صاحب اس خط کو نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو جیب میں رکھ لیتا اور فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر رو دیتا تھا۔

ہمارے شاندار ماضی کی یہ چند دلکش تصویریں تھیں، جو بتاتی ہیں کہ سلاطین وعلماء باہم مربوط تھے علم کی ترقی اور دین کی سربلندی کے لئے کوشاں تھے بلکہ کبھی اعتبارات سے علماء کا پلہ بھاری تھا۔ اور اس خوشگوار اتحاد کے نتیجہ میں علماء کا وقار قائم تھا، علم کی ترقی ہورہی تھی، کتبخانے آباد ہورہے تھے۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

بقیہ صفحہ ۱۲: تعلیمی کانفرنس

دعوت وتربیت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دینی مدارس وقتاً فوقتاً ایسے علمی مذاکرات کا انعقاد کریں جن کے ذریعہ طلبہ کو عصر حاضر کے افکار، دیگر مذاہب کے نظریات ان کی تاریخی حیثیت اور اسلام سے ان کے تقابل پر وافر معلومات فراہم ہو اور وہ غیرمسلموں اور جدید نسل میں دعوت دین کا کام کرسکیں اور تقریر وتحریر دونوں میں ان کو عبور حاصل ہو تاکہ دعوت و تربیت کے کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔

کانفرنس نے اس دعوت ومشق کے لئے مدارس اور اساتذہ دونوں پر زور دیا ہے کہ وہ طلبہ کو قرب وجوار کے علاقوں میں لے جائیں اور اپنی نگرانی میں تبلیغ کا کام کروائیں تاکہ طلبہ کو اسی وقت سے عوام سے رابطہ قائم کرنے کی مشق ہو۔

کانفرنس نے اپنی آخری قرارداد میں مدارس کے وفاق پر زور دیتے ہوئے کہا کہ نصاب تعلیم میں یکسانیت ہو، امتحان کا نظم ایک ہو اور نظام تعلیم ایک ہو — اور بین المدارس علمی وتحقیقی مذاکرہ کا انعقاد ہو اور اساتذہ کی ٹریننگ اور ان کے معاشی معیار کو زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے پر بھی زور دیا۔

کانفرنس ہر حیثیت سے کامیاب رہی، نظم وانتظام، مہمانوں کی راحت اور قیام کا انتظام بہت اچھا رہا اور منتظمین کو ہر وقت اس کی فکر اور احساس رہا کہ آنے والے مہمانوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے پائے، دارالعلوم کے لئے میر عالم تالاب پر ایک وسیع قطعہ اراضی لے لیا گیا ہے اور تعمیر کا کام بھی شروع ہوگیا ہے اور بعض حصے تکمیل بھی ہوچکے ہیں اور امید ہے کہ مابقی حصے بہت جلد مکمل ہوجائیں گے اور پھر دارالعلوم نئی جگہ اور نئی عمارت میں منتقل ہوجائے گا — ۲۵ فروری کو دن میں کانفرنس کا مقام یہی نئی عمارت اور نئی جگہ تھی۔!!

طلبہ کے قلم سے

از: محمد فیاض عالم ندوی

اسلام، دوسروں کی نظر میں!

آج دنیا کی ہر قوم اور ارباب فکر اس بات پر پوری طرح متفق ہوتے جارہے ہیں کہ جب تک انسان کی دنیاوی زندگی کو مذہبی خطوط پر منظم نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک موجودہ ترقی یافتہ دنیا کی کامیابیاں بھی انسانوں کو امن وآشتی کا پیغام نہیں دے سکتی ہیں۔ منکرین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے جن گوشوں تک قانون اور محافظان قانون کی رسائی نہیں ہوسکتی مذہب ان گوشوں کا پتہ دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جن برائیوں کو قانون روکنے سے قاصر رہتا ہے، مذہب ان پر پوری طرح قدغن لگانے پر کامیاب رہا ہے۔

انسان کی دنیاوی زندگی کو مذہب کی بنیاد پر منظم کرنے کی ضرورت کو ماننے والے ہنوز جس بات پر اتفاق رائے نہیں کرسکے وہ یہ ہے کہ انسان کی دنیاوی زندگی کو کس مذہب کی بنیاد پر منظم کیا جائے؟ اور یہ اختلاف صرف اس وجہ سے ہے کہ عموماً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مذہب یا تو انسان کو اس عالم رنگ وبو سے الگ کردیتا ہے یا پھر وہ ایسے راستے پر ڈال دیتا ہے جس کی موجودگی میں سماجی قدروں کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ لیکن کیا دنیا کا کوئی مذہب بھی انسان کی اس بڑی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا؟

اسلام نے زندگی کا ایک نظام اور ضابطہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا اور یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ اس طویل مدت میں ایک بار بھی اس کے بنیادی ضابطے میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اس کے باوجود یہ ضابطہ پوری دنیا اور دنیا کے مختلف حالات میں نہ صرف انسانی ضرورتوں کو پورا ہی کررہا ہے بلکہ اس کے ماننے والوں میں بھی برابر اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مارکس ڈاڈز اسلام کی حیرت انگیز اصلاحات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں، "مجھے یقین ہے اور ہر غیر متعصب شخص بآسانی تسلیم کرے گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب اور نظام اصلاح موجودہ تمام مذاہب کے مقابلے میں بے حد ترقی یافتہ اور قابل قبول ہے"۔

اسلام نے انسان کے ضمیر اور اس کے عقائد کی آزادی کو تسلیم کیا ہے، اور اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آزادی کے اس اصول کو عملی زندگی میں پوری طرح نافذ کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ثنا خواں اور مداح نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی رہے ہیں اور اس نے اپنے دشمنوں سے اپنی حقانیت، اپنی ہمہ گیری کا لوہا منوا لیا ہے۔

مسٹر طامس کارلائل مشاہیر یورپ میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحات پر نظر ڈالتے ہوئے رقم طراز ہے، "اس وقت خدا کی مخلوق میں آپ کے کلام اور اصلاحات کے ماننے والے بہ نسبت کسی دوسرے مذہب کے بہت زیادہ ہیں، اور یہ اسلام کی حقانیت کا کھلا ثبوت ہے"۔

سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات نے حیرتناک اور عظیم الشان کام کر دکھایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسانوں نے نہ کبھی اسلام جیسا روحانی زندگی کا عروج دیکھا تھا اور نہ ایسا پختہ ایمان، ہم فراخ دلی سے اقرار کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعین میں خدا کے توحید کا نغمہ اب بھی سنائی دے رہا ہے، اسلامی تعلیم کے ذریعے اخلاقی قدروں میں اضافہ ہوا۔ ایمانی دائرے کے اندر برادرانہ محبت کی تلقین کی گئی یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور بیکسوں اور بے بسوں کی خاطرداری ہونے لگی۔ غرض اسلام ایسے اعلیٰ کردار پر فخر کرسکتا ہے جس کی دوسرے مذاہب کو خبر تک نہیں۔

ہربرٹ صاحب نے لکھا ہے کہ، اسلام اور تعلیمات محمدیؐ میں قابل ستائش اخلاقی سبق اور مسلم وغیر مسلم دونوں کے لئے رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

مسٹر جنگو بارک لکھتے ہیں کہ اسلام انسانی کردار کو بلند کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ڈبلائی ڈون لکھتے ہیں کہ عیسائی جنھوں نے اسلام کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے اگر وہ افریقہ کے شمال اور مغرب میں جاکر دیکھیں جیسا کہ میں نے دیکھا ہے تو ان کو معلوم ہوجائے گا کہ دوسری جماعتوں اور اسلام میں کتنا بڑا فرق ہے ایک طرف تو ضابطہ، قانون ندارد، دوسری طرف ٹھوس قواعد وضوابط سے بھرپور۔

ڈاکٹر بارتھ، وہ اسلام کی حقانیت کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں، "غیر مسلموں کا حلقہ بگوش ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ یقیناً اسلام کے اندر غیر معمولی کشش ہے"۔

مسٹر ہالم، اپنی مشہور کتاب تاریخ آئین سلطنت انگلستان میں رقم طراز ہیں، "جن لوگوں نے دین اسلام قبول کیا ان کو وہی حقوق بخشے گئے جو فاتح قوم کے ہوتے ہیں"۔

ان مذکورہ مشاہیر کے علاوہ مسٹر گاڈفری، مسٹر ڈوسی، مسٹر سرجان مالکم جرمن مؤرخ مسٹر گوئٹے، مسٹر جان چیمبر، مسٹر جان ڈیوپول اور دوسرے مشہور مشاہیر عالم نے اسلام کو انسانیت کا سب سے بڑا محافظ اور علمبردار قرار دیا ہے اور یہ صرف اسلام کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنے دشمنوں سے بھی اپنی حقانیت اور ہمہ گیری کا لوہا منوالیا۔ ●●

بقیہ صفحہ ۵: حسن البنا

سے بھرتا تھا ان ساری خصوصیات وصفات کے ساتھ قوم کے افراد اور عوام الناس سے ان کی محفلوں اور مشغولیت کی جگہوں میں ملنا، غفلت کے اڈوں پر ان سے ملاقات کرنا، اور حکمت وتدبیر کے ساتھ دھیرے دھیرے ان کی تربیت کرنا ہمہ وقت متحرک اور کام میں مشغول رہنا ان کا شعار تھا اور یہی ساری صفات اسلامی وربانی دعوت اور ایسی دینی تحریک کی جان ہوتی ہیں جو معاشرہ میں تعمیری واصلاحی انقلاب لانا چاہتی ہے اور وقت کے دھارے اور تاریخ کے رخ کو موڑنا چاہتی ہے۔ اس لحاظ سے دعوت واصلاح کے میدان میں کام کرنے والے ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا اور اس پر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے غور وفکر کرتے رہنا نہایت مفید ہے۔

اس کتاب کی دوبارہ طباعت اور لوگوں میں اس کو پھیلانے اور عام کرنے پر تعجب نہیں، قابل تعجب یہ بات ہے کہ مسلمانوں کا کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی ہو، اس اہم دعوت کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا جس نے عالم عربی کی نئی نسل میں اسلام کی صدا بہار صلاحیت اور اس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا، جس نے جدید نسل کے دلوں میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی ان کے احساس کمتری وشکست خوردگی کا مقابلہ کیا، جس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا، اس دعوت نے نوجوانوں کی بے راہ روی، ان کی اندرونی کمزوری اور ہوا وہوس کے پیچھے دوڑنے کی ذہنیت کا مقابلہ کیا اور اس کے تن نازک میں جان ڈال دی اور اقبالؒ کے الفاظ میں ع

کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کردیا

ان کی اس دعوت سے یہ جدید نسل تازہ دم ہوگئی، اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور اس نے شجاعت وجوانمردی اور صبر وثبات قدمی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔

اس تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور اس کے نقوش کو مٹانے کی کوشش، اور اس کے چلانے والوں کو قید وبند اور جلاوطنی کی سزائیں اور رونگٹے کھڑا کردینے والی اذیتیں، وہ بدترین جرم ہے، جس کو تاریخ اسلام کبھی معاف نہیں کرسکتی، یہ ایسا المیہ ہے جس کو عالم اسلام کبھی فراموش نہیں کرسکتا، یہ عالم عربی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہوسکتا۔ اس جرم کا کفارہ ملک کے کسی بڑی سے بڑی تعمیری وسیاسی خدمت سے نہیں ادا کیا جاسکتا۔ یہ اتنا وحشتناک جرم ہے کہ جس کی مثال صرف تاتاریوں کی وحشت وبربریت یا قدیم مسیحی دنیا کے دور تعصب میں ملتی ہے۔

مراسلہ

از: محمد شمیم

ملک کے موجودہ ماحول میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام معاشی و تعلیمی امور انجام دینے کے لئے بلاسودی بینکنگ سسٹم کے اقتصادی ادارے قائم کرنا

مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی میں اس چیز کا بڑا دخل ہے کہ ان کی کوئی بڑی مالی تنظیمیں نہیں ہیں۔ سرکاری بینکوں میں صنعت و تجارت اور دوسرے کاموں کے لئے حکومت کی طرف سے سرکاری سہولتوں کے باوجود ان کے ساتھ تفریق برتی جاتی ہے بینکوں سے قرض ملنے میں انھیں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پچھلے دنوں حکومت کی جانب سے مقرر کردہ اعلیٰ اختیاری پینل کے سربراہ ڈاکٹر گوپال سنگھ نے جو رپورٹ وزیر اعظم صاحبہ کو پیش کی ہے۔ اس میں بھی اقتصادی بدحالی کا سبب قرض دینے میں تفریق کا برتا جانا ہے اور انھیں کے تناسب سے قرض نہ دئے جانے کی بات کہی ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد سے نہ جانے کتنی شکایتیں اور رپورٹیں حکومت کے سامنے پیش ہوئیں اور نہ جانے کتنی مراعات و سہولتوں کا حکومت کی جانب سے اعلان ہوا، مگر فرقہ پرستی، تعصب، تنگ نظری کی بنیاد پر ملک کے ہر شعبۂ زندگی میں ان کے ساتھ تفریق کی گئی۔ تعلیمی و سماجی میدانوں میں انھیں پسماندہ بنانے کی بھی انتہائی خطرناک تدبیریں اختیار کی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ اب تک کسی نہ کسی صورت میں برابر جاری ہے حکومت وقتاً فوقتاً جو سہولتیں دیتی ہے یا سہولت دینے کا اعلان کرتی ہے اس کے پیچھے بھی سیاسی مقاصد کار فرما ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان سہولتوں کا خاطر خواہ فائدہ اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کو نہیں پہنچ پاتا ہے اور وہ تنگ نظری، تعصب و تفریق کے بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔

اب اگر حکومت ملک کے اس ماحول میں ڈاکٹر گوپال سنگھ کی رپورٹ کی روشنی میں اقلیتوں کی تعلیمی و اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے کچھ اقدام کرتی بھی ہے تو ضروری نہیں کہ اقلیتوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو اس کا خاطر خواہ فائدہ پہنچے کیونکہ موجودہ ملک کا ماحول مسلمانوں کے لئے انتہائی ناسازگار ہے ملک کا وہ کون سا شعبہ ہے جہاں ان کے ساتھ تفریق نہیں کی جاتی ہے۔ قومی پریس و اخبارات تک ان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اس حال میں کیا سہولتیں مل سکتی ہیں۔

لہٰذا اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کو موجودہ ملک کے ماحول کے پیش نظر حکومت کی طرف سے اعلان کردہ سہولتوں و مراعات پر محض اب بھروسہ نہ کرنا چاہیے، بلکہ اقتصادی ترقی کے لئے سرکاری سہولتوں سے استفادہ کے ساتھ ساتھ "اپنی مدد آپ" کے زریں اصول کو اپناتے ہوئے عین اسلامی نظریات کی روشنی میں بلاسودی بینکنگ سسٹم کے اپنے مضبوط و وسیع معاشی اداروں کو وجود میں لانے پر بھی توجہ کرنی چاہیے تاکہ ملت کے تمام مالی و تعلیمی امور باقاعدگی سے انجام پاسکیں۔

اس سلسلے میں ملت کے کچھ دردمندوں نے ملک کے مختلف حصوں میں ضلع و شہری سطح پر اس قسم کے اداروں کی ابتدا کی ہے جن میں کچھ اپنی مثالی کارکردگی کی بنا پر بے حد معروف و مشہور ہو چکے ہیں۔ ان مثالی اداروں میں بہرائچ کی "ملی امدادی سوسائٹی" بھی ہے جو ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی اور آج وہ ایک مضبوط اور شاندار فینانسنگ ادارہ کی حیثیت سے اپنی نمایاں اور مثالی کارکردگی پر بلاشبہ فخر کر سکتی ہے جو لوگ ملت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اس ادارہ کے طریقہ کار اور کارکردگی کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کریں بلکہ خود جاکر اس جیتی جاگتی تصویر کو دیکھیں پھر اپنے مقام پر آکر کام کریں کیونکہ عملی نمونہ دیکھے بغیر صحیح طور پر کام کرنا اور کام کرنے کا وہ حوصلہ پیدا ہونا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

آج مشرقی اضلاع میں درجنوں اقتصادی تنظیمیں اس ادارہ سے روشنی حاصل کر کے سرگرم عمل ہیں۔

کم و بیش بہرائچ میں مسلمانوں کی آبادی پچاس پچپن ہزار ہوگی، جب کہ "ملی امدادی سوسائٹی" کے کھاتہ داروں کی تعداد ابھی صرف دس ہزار ہی تک پہنچی ہے۔ آبادی کے تناسب سے کھاتہ داروں (معاونین) کی تعداد اتنی کم ہونے پر بھی یہ ادارہ ہندوستان کے مثالی اداروں میں شمار ہونے لگا ہے اور اگر بہرائچ شہر کی ہی کل مسلم آبادی صرف پانچ یا دس روپیہ کی کھاتہ دار بن جائے تو یہ ادارہ ضلع کے مسلمانوں کے لئے ایک نیا معاشی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔

ملت کے تمام دردمند حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ضلع و شہری سطح پر اس قسم کے ادارے قائم کرنے کے لئے اس ادارہ کی کارکردگی و طریقہ کار کا بغور مشاہدہ کریں جہاں اس قسم کے ادارے قائم ہیں وہاں مزید قائم کرنے کے بجائے انھیں کے ساتھ مل کر کام کریں تاکہ ملت کو نہ صرف سود کی لعنت سے بچایا جا سکے بلکہ بلاسودی قرض دے کر ان کی معاشی و اقتصادی پسماندگی کو بھی دور کیا جا سکے اور معاشی خوش حالی کی نئی راہیں کھولی جا سکیں۔

غزل

مجیب بستوی

ہمارے ہاتھ میں جام شراب ہوتا ہے
جب ان کی یاد میں کچھ اضطراب ہوتا ہے

الٰہی خیر گلستانِ آرزو کی ہو
خرد کے واسطے وہ بھی خراب ہوتا ہے

جسے پسند ہوں رسوائیاں زمانے کی
رہِ وفا میں وہی کامیاب ہوتا ہے

کہیں پہ کھولے گئے ہیں کرم کے دروازے
کہیں پہ بند سہاروں کا باب ہوتا ہے

وہیں پہ لائی مری زندگی مجھے افسوس
جہاں پہ ماتم عہد شباب ہوتا ہے

ہوئی چمن میں دل آویز گفتگو کس کی
کلام کس کا بہت لاجواب ہوتا ہے

نگاہ اپنی بچائے ہوئے گذر جانا
مجیب آج کوئی بے نقاب ہوتا ہے

مراسلات

ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ

ہندوستان کے شمال میں نیپال کی سرحد پر واقع ضلع بہرائچ میں چند نوجوانوں نے عین اسلامی نظریات کی روشنی میں "ملی امدادی سوسائٹی" نام کا ایک بلاسودی بینک ۱۹۷۲ء میں قائم کیا اور آج وہ ایک مضبوط فائینانسنگ ادارہ کی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔

اس کی پانچ منزلہ عمارت زیر تعمیر ہے اس کے تہ خانہ میں اسٹور روم، پہلی سطح پر "ملی مارکیٹ" دوسری تا چوتھی منزلوں پر لائبریری، مہمان خانہ، میٹنگ ہال، کوچنگ سنٹر، ٹائپ سنٹر، ریڈنگ روم و دیگر ضروری آفس ہوں گے۔ اس پر تقریباً دس لاکھ کا سرمایہ خرچ ہوگا، اب تک ڈھائی لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ پہلی منزل مکمل ہونے پر ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ کی آمدنی کا سلسلہ انشاء اللہ شروع ہو جائے گا۔

اس ادارہ نے قیام سے اب تک سوا دو کروڑ روپیہ کا لین دین کیا جن میں بارہ ہزار افراد کو تقریباً ۹۵ لاکھ روپیہ بلاسودی قرض کی صورت میں دے کر ان کو سود کی لعنت سے بچایا و نیز خدمت کے دوسرے میدانوں میں اپنے تیرہ نکاتی پروگرام کے ذریعہ خدمت خلق کا جذبہ رکھتے ہوئے شہر کے مختلف محلوں میں ملی ہومیو شفاخانوں کے ذریعہ ہزاروں بندگان خدا کو فائدہ پہنچا رہا ہے، ساتھ ہی تعلیمی میدان میں بچیوں کا ایک مدرسہ "مدرسۃ البنات" جس میں ڈھائی سو بچیاں چھ معلماؤں کے ذریعہ ابتدائی تعلیم دینی و دنیاوی دونوں حاصل کر رہی ہیں، ضلع میں دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ادارہ کی طرف سے آرگنائزر مقرر ہے۔ "تحریک پیام انسانیت" کی دعوت و پیغام کو عام کرنے کی بھی جد و جہد ہو رہی ہے اور اس سلسلے کے کئی جلسے بھی ضلع بہرائچ میں ہو چکے ہیں۔ ہونہار طالب علموں کو وظائف، غریب و ناداروں کی امداد، لاوارث مسلم میتوں کی تجہیز و تکفین وغیرہ ادارہ کے طریقہ کار میں شامل ہے۔

مسجد کا پیغام، امتِ مسلمہ کے نام

پندرھویں صدی ہجری کی آمد نے اس سوال کو تازہ کر دیا ہے کہ دنیا میں جس قوم کا نام مسلمان ہے اس کا اس عالم میں کیا مصرف ہے؟ اور خود مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ سوال گردش کر رہا ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت و عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کے کیا "طریقے" ہو سکتے ہیں۔ ہم نے "طریقہ" نہیں استعمال کیا ہے بلکہ طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی قوم کی بیداری اور ترقی کسی ایک طریقہ کار اور ایک سبب کی رہین منت کبھی نہیں ہوتی ہے بلکہ کئی عوامل و اسباب مل کر ایک مثبت نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔

آئیے! ہم لوگ اس وقت مسجد نبوی میں حاضر ہو رہے ہیں، مگر آج کی نہیں، ماضی کی مسجد نبوی، وہ جو دورِ نبوی میں تھی پھر وہ جو عہد خلفاء راشدین میں تھی اور پھر وہ جو ان کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں تھی۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ماضی کی اس مسجد نبوی اور اس کے نتیجہ میں اس عہد کی دوسری تمام مساجد میں ایک طرف درس و تدریس کے مختلف الانواع حلقے سجے ہوئے ہیں۔ فقہ، حدیث، تفسیر، ذکر و اذکار سیکھے اور سکھائے جا رہے ہیں، وہ دیکھئے دوسری طرف نو مسلموں کی تربیت و تعلیم کے لئے ایک "کالج" بھی اسی میں کھلا ہوا ہے۔ "پارلیمنٹ" بھی گاہ گاہ قائم ہو رہی ہے، مسائل پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے، فقہی و شرعی نہیں بلکہ آجکل کی اصطلاح میں خالص دنیوی یعنی سیاسی، اقتصادی و معاشرتی مسائل آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ابھی نکاح و طلاق کے مسائل فیصل ہو رہے تھے تو اب سیاست و معاش کے "پرابلمس" حل کئے جا رہے ہیں، غرض ایک مسجد ہزار کام، دین و دنیا، مادیت و روحانیت سب کی تقسیم کا ایک ہی مرکز ہے۔

اس مسجد نبوی میں مقیم یہ علوم و فنون اور میدان سیاست و عبادت کے ماہرین فن ہی تھے، جنھوں نے مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر بساطِ عالم کو الٹ دینے کا خاکہ بنایا اور پھر انہی چٹائیوں کی عبادت سے اس میں رنگ بھرا اور انہی مسجدوں کے منبروں سے صدائے حق ایسی بلند کی کہ اس کی بازگشت سارے عالم میں پھیل گئی۔ وہ تو وہ، ان کے تلامذہ اور شاگرد بھی جہاں بیں، جہاں آرا اور جہاں بان بن گئے، بن ہی نہیں گئے بلکہ اپنے بعد دوسروں کو بنا گئے۔ عمر رفتہ کی آواز بھی سنئے کہ اگر اس مسجد نبوی کی یہ ہمہ ہمی و ہمہ گیری نہ ہوتی اور اگر وہ ماہرین فن، مسجد کے منبروں کی نزاکتوں سے واقف نہ ہوتے اور اپنی ذمہ داریوں کو اگر نہ ادا کرتے، تو کیا نتائج وہی برآمد ہوتے جو آج تاریخ کے صفحات پر ثبت و منقوش ہیں؟

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

ذرا سی دیر میں ہم تاریخ اسلامی کا طویل سفر کر آئے۔ اب ہم پھر پندرھویں صدی ہجری میں قدم رکھ رہے ہیں، مگر یہ کیا، اب تو "مسجدیں" بھی بدل چکی ہیں، درس و تدریس کے وہ حلقے کہاں چلے گئے؟ وہ "کالج" کیا ہوا؟ اور وہ "پارلیمنٹ" کہاں رخصت ہو گئی؟ اور ان سب سے بڑھ کر وہ ائمہ مساجد کہاں چلے گئے جو معاشرہ کی رفتار کے نباض اور اس کے اداشناس ہوا کرتے تھے، جو اپنے خطبوں میں امت مسلمہ کے ایک ایک فرد کی دیکھ بھال اور نگہداشت کیا کرتے تھے بلکہ جو ہر نئی نسل کے خاموش اور چھپے ہوئے معمار ہوا کرتے تھے؟ ہائے کیا برا وقت آگیا ہے۔ اقبال جیسے "اسلامی" شاعر کو بھی غصہ دلا دیا اور وہ مارے جھنجلاہٹ کے یہ کہنے پر مجبور ہوئے؎

قوم کیا ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانے یہ دو رکعت کا امام

لیکن نہیں! یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کرے؎

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اب پھر امت اسلامیہ کی اصلاح کا آغاز ابتدا ہی سے ہوگا اور مسجد ہی اسکا مرکز و منبع ہوگا، ہمیں پھر موجودہ عہد کی مساجد کو عہد قدیم کی مساجد بنانا ہوگا، ہیئت و حالت میں نہیں بلکہ کیفیت و حقیقت میں۔ علامہ شبلیؒ نے نصیحت بھی تو کی تھی کہ "مگر مسلمانوں کی ترقی اس میں ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں، یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا ملیں" بنگلور کی ھدیٰ کمیٹی مولانا شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی ندوی کی قیادت و صدارت اور مولانا عبد اللہ باشا ندوی کی سرپرستی میں اسی مہم کو لے کر اٹھی ہے اس کے اساسی مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ علماء و حفاظ، ائمہ و خطباء، مؤذنین و مذہبی مدرسین کی تنظیم و اتحاد باہمی۔
۲۔ علماء و ائمہ کی رہنمائی میں مختلف قومی و ملی مسائل کا حل۔
۳۔ دینی مکاتیب کا قیام اور ان میں ایک ہی نصاب کا اجراء۔
۴۔ تجوید قرآن اور مؤذنی کے کورس کا اجراء۔
۵۔ مذکورہ حضرات کی معاشی و اقتصادی مسائل میں مدد و تعاون۔

امت اسلامیہ کی داخلی اصلاح کا یہ ایک مؤثر ذریعہ ہے، اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سطروں کے بعد قدموں کا، فکر و نظر کے بعد سعی پیہم اور جہد مسلسل کا، اور شور و ہنگاموں اور دلفریب نعروں کی جگہ خاموش مثبت عمل اور عملی ٹھوس اقدامات کا وجود ظہور میں آئے یعنی مسجد نبوی کا گذشتہ ماحول آج کی مسجدوں میں پھر جلوہ گر ہو جائے۔ فھل من مزید؟

سرزمین رنگ و بو لکھنؤ کے مسحور کن عطریات
شمامۃ العنبر ― سلطنہ ― زعفرانی حنا
محمد سلیمان محمد یوسف پرفیومرس
یوسف بلڈنگ نادان محل روڈ لکھنؤ (انڈیا) سے طلب کریں

دارالعلوم حیدرآباد کی تعلیمی کانفرنس

دارالعلوم حیدرآباد پنجشاہ حیدرآباد شہر میں ایک عرصہ سے مولانا محمد حمید الدین عاقل کی رہنمائی و سرپرستی میں علمی اور دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ مولانا حمید الدین عاقل صاحب آندھرا پردیش اور خاص طور پر حیدرآباد شہر کی ایک ممتاز علمی اور دینی شخصیت ہیں۔ ان کی سرپرستی میں دارالعلوم کا قیام اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ دارالعلوم صحیح خطوط پر مسلمانوں کی دینی اور ملی خدمات انجام دے رہا ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ اسی لگن سے دیتا رہے گا یہاں کے اساتذہ اور دارالعلوم سے متعلق دوسرے حضرات بڑی جد و جہد، ایثار اور محنت و لگن کے ساتھ کام کر رہے ہیں، فروری کی ۲۴، اور ۲۵ تاریخ کو دارالعلوم کی طرف سے ایک بڑی دینی اور تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کے علاوہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ رحمانیہ مونگیر، امارت شرعیہ بہار، جماعت اسلامیہ ہند آندھرا پردیش اور مہاراشٹر کے مدارس عربیہ کے نمائندہ علماء نے شرکت کی۔

چونکہ یہ کانفرنس دینی و دعوتی اور تعلیمی تھی اس لئے دو دن میں اس کی مختلف نشستوں میں علماء نے مدارس عربیہ کے نصاب اور نظام تعلیم پر اپنے تجربات کی روشنی میں مقالے پڑھے اور تقریریں کیں، یہ مقالے عنقریب دارالعلوم حیدرآباد کی طرف سے شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گے اور امید کی جاتی ہے کہ مدارس عربیہ کی ترقی اور اس کے تعلیمی اور انتظامی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے انشاء اللہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔

دینی اور دعوتی پہلو سے یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی، دونوں تاریخوں میں رات میں پرانی حویلی کے میدان میں بڑا اجتماع عام ہوا جس میں پچاس ہزار سے زائد مسلمانوں نے کانفرنس میں آنے والے علماء کی تقریریں سنیں اور ان کے مواعظ سے مستفیض ہوئے۔ اس کانفرنس میں متفقہ طور پر تجاویز بھی منظور ہوئیں۔

کانفرنس نے اپنی تجاویز میں دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کو ایک مسلّم حقیقت قرار دیتے ہوئے انفرادی و اجتماعی سطح پر دینی تعلیم کو عام کرنے پر زور دیا نیز کانفرنس نے اپنے تجاویز میں دینی مدارس کو اسلام کا قلعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ مدارس مسلمانوں کی ملی اور اجتماعی ضروریات کے تکمیل کے مظہر ہیں اور اسلام و مسلمانوں کی قوت و استحکام ان قلعوں ہی پر موقوف ہے اور ان قلعوں کا استحکام ملی امتیازات و مذہبی تشخصات و تعلیمی انفرادیت کے بقاء کے مترادف ہے۔ کانفرنس نے اپنے اجلاس میں نصاب و نظام تعلیم پر بھی غور کیا اور اس نے جدید مسائل کی واقفیت، فقہ کے ساتھ معاشیات اور اصول قانون کی تدریس، حالات حاضرہ کی روشنی میں اسلام کے عقائد و افکار کی حقانیت کا ثبوت، اور جدید و قدیم لادینی و مادی افکار کا تعارف اور اس کا تنقیدی جائزہ اور اس کے تقابلی مطالعہ کو بھی نصاب پر زور دیا اور حالات حاضرہ کے تحت مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے بہترین اور مفید نصاب تعلیم کو ترتیب دینے اور اس کو نافذ کرنے پر زور دیا نیز کانفرنس نے نصاب تعلیم کے ضمن میں عربی زبان کو بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے مڈل اور ہائی اسکول کے نصاب میں داخل کرنے پر بھی زور دیا اور عربی ٹیچرس ٹریننگ کے لئے بھی کانفرنس نے اپنے صوبہ آندھرا پردیش کی حکومت سے درخواست کی۔

اس کانفرنس نے موجودہ ذہنی، فکری اور تہذیبی ارتداد پر تشویش کا اظہار کیا اور علماء سے اپیل کی کہ وہ مغربی سے مسلمانوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں۔ کانفرنس نے اس ضمن میں نظام

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

حمدِ خالقِ کونین و نعتِ سرورِ کائنات

تسنیمؔ فاروقی

مجھ کو یارب زمانے کی شہرت نہ دے اور نہ تجھ سے مجھے کوئی دھن چاہیئے
تیرے محبوب کی خاک پا سر پہ ہو بس مجھے ایسا دیوانہ پن چاہیئے

یہ بہاریں جو دنیا کی تقدیر ہیں، آج ہیں کل خزاں میں بدل جائیں گی
جس کی خوشبو سے جنت کی خوشبو ملے مجھ کو وہ مصطفائی چمن چاہیئے

میں بندھا ہوں مسائل کی زنجیر سے مجھ کو آزاد کر دے غمِ دَور سے
جو تری بندگی کی سزا میں ملے مجھ کو وہ قید و دار و رسَن چاہیئے

رحمتِ حق برس جائے آثار پر، نور ہی نور چھا جائے سنسار پر
ایک ایسے سویرے کا ارمان ہے ایک ایسی سنہری کرن چاہیئے

پہلے سجدوں کے قابل بنا لو جبیں پھر کسی آرزو کی گذارش کرو
اُن کے قدموں کو پانا بھی آساں نہیں ان کو اپنا بنانے کا فن چاہیئے

یہ سلگتی ہوئی پتھروں کی زمیں بے زباں قافلے سنگدل رہنما
تنگ مومن پہ ہے دائرۂ زندگی کوئی حیدرؓ سا خیبر شکن چاہیئے

سازشوں کے اندھیرے ہیں پھیلے ہوئے سر پہ تلوارِ باطل ہے لٹکی ہوئی
کوئی تدبیر سوچو عمل کچھ کرو ایسے عالم میں کوئی جتن چاہیئے

سبز گنبد کے روشن جھروکوں سے میں اپنی حسرت کا اظہار کرتا ہوں
دو ستارے جہاں چاند کے پاس ہیں مجھ کو وہ نور کی انجمن چاہیئے

چھین لے اس سے دنیا کی رنگینیاں، بخش دے اپنی رحمت سے تسنیم کو
خاک طیبہ پہ تربت کا ارمان ہے آبِ زمزم میں بھیگا کفن چاہیئے

مجلس ادارت

نگرانِ اعلیٰ
مولانا ابو العرفان ندوی

مدیر: الحفیظ ندوی
شمس الحق ندوی
محمود الازہار ندوی

پرنٹر، پبلشر جمیل احمد ندوی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات، شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا۔

بقیہ صفحہ

کا طوطی بول رہی تھی جن کو امریکی وزارت خارجہ ہی کے ایک دوسرے ذمہ دار جیمس رزقی نے ایک دفعہ "قصائی" کے لفظ سے یاد کیا تھا۔ امریکہ کو عربوں کا مذکورہ بالا اقدام پسند نہیں تھا امریکہ نے بالواسطہ طور سے سلیمان فرنجیہ کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا لیکن وہ نہیں مانے تو نیویارک ہوائی اڈہ پر امریکی پولس ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آئی کہ شاید اسی سے چڑھ جائیں اور واپس ہو جائیں لیکن اس کا بھی اثر نہیں ہوا اور سلیمان فرنجیہ نے اقوام متحدہ میں عربوں کی پرزور ترجمانی کی لیکن اس کی سزا لبنان کو بھگتنی پڑی اور اب تک بھگت رہا ہے۔ کیسنجر نے لبنان کو تباہ کر دیا۔ مسیحیوں کو بھی اور مسلمانوں کو بھی لبنان کا مسلم عیسائی اتحاد ہی نہیں ختم ہوا پورا لبنان بھی تباہ ہوا۔ اور کیسنجر اور ان کے ہم مذہب اس انجام سے مسکرا رہے ہوں اور یہودی عقائد کے مطابق غیر یہودیوں کی تباہ کاری پر اجر و ثواب کے بھی منتظر ہوں۔

ملک فیصل نے پہلی کانفرنس کے موقع پر ہی مسلم ممالک کو بھی متحد کرنے کی بھی کوشش کی اس وقت متعدد مسلم ممالک اسرائیل کی طرف جھکے ہوئے تھے، ان میں ایران بھی تھا اور ملک فیصل شاہ ایران کو بیت المقدس کی اہمیت سمجھانے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس دلانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس کے بعد ہی سے اسرائیل کے متعلق ایران کی پالیسی میں کافی تبدیلیاں آئی تھیں اور اس دفعہ کانفرنس میں بھی اسلامی اتحاد اور پھر اسلامی و مسیحی اتحاد کی کوششیں کی گئیں اور مسیحی کلیسا نے تو جواب ملا کر لبنان کے مسیحی صدر الیاس سرکیس کانفرنس میں شریک ہوئے اور لبنان کا مسئلہ اس طرح پیش کیا کہ وہ مسلم ممالک ہی کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح ارتھوڈکس کلیسا کے مذہبی رہنما نے کانفرنس کو خطاب کیا اور ایران کو کانفرنس میں شریک کرنے کی بڑی کوششیں ہوئیں۔ شاہ فیصل نے شاہ ایران کو اسلامی اتحاد میں شامل ہونے اور بیت المقدس کی حفاظت کی ذمہ داریوں میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن اس موقع پر مؤتمر اسلامی کے سکریٹری جنرل اور دوسرے رہنما سر توڑ کوششوں کے باوجود موجودہ ایران کو مکہ تک لانے میں ناکام رہے، اور ایران کے اسلامی انقلاب نے کعبۃ اللہ کے سایہ سے دور رہنا ہی پسند کیا۔ اسلامی انقلابی ایران کے آیات اللہ کو خانۂ کعبہ کے زیر سایہ "عراقی کافروں" کے ساتھ بیٹھنا گوارہ نہیں تھا لیکن دہلی کی غیر جانبدار کانفرنس میں ایران کی نمائندگی تھی جب کہ وہ عراقی کفار یہاں بھی موجود تھے اور کافی سرگرم بھی تھے۔

بہرحال خدا کو یہی منظور تھا اور ممکن ہے ایران کی عین موجودگی ہی میں کوئی مصلحت مضمر رہی ہو۔ لیکن سعودی وزیر خارجہ امیر سعود الفیصل نے ایران عراق جنگ پر درد دل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اگر یہ جنگ روکی نہ گئی تو اس کی آگ پورے عالم اسلام میں شعلے بھڑکا سکتی ہے۔

اس کانفرنس کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ اس نے سعودی عرب کے وزن و وقار میں اضافہ کر دیا ہے، لیکن اس نے اسی طرح سعودی رہنماؤں کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ کیا ہے اور پوری دنیا کے مسلمان یہ دیکھنے کے منتظر ہیں کہ حرمین شریفین کے محافظ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے اور اپنی اہلیت ثابت کرنے میں کہاں تک کامیاب رہتے ہیں۔؟ دنیا کے مسلمانوں کی امیدیں اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔!!

بقیہ صفحہ

کو والدین کے سامنے ہی ذبح کیا جاتا؟ اس طرح کی کتنی مثالیں ہیں جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس متمدن زمانہ میں ظلم و جور، ذلت و رسوائی، جرائم و تشدد، طمع و حرص، جھوٹ و دغا کی فضا جس قدر عام ہے اسلام سے پہلے زمانہ میں اسقدر نہ تھی۔ دور جاہلی کا انسان اتنے سخت حالات سے دوچار نہ تھا جتنا کہ آج کا متمدن (CIVILISED) شخص تمدن و فن کی وجہ سے دوچار ہے۔ آج تو یہ حال ہے کہ ظلم و شقاوت، غلام و تابعدار بنانے، حقوق کی پامالی کرنے، بے عزتی و آبروریزی کو بہت بڑا کامیاب فن سمجھا جانے لگا نیز دین و اخلاق کا لبادہ اوڑھ کر اس کی آڑ میں لوگوں نے جو ڈھونگ مچا رکھا ہے یہ بھی آج ایک کامیاب فن ٹھہرا۔

ان ساعد حالات میں جس تیزی کے ساتھ اخلاقی دینی اور انسانی اقدار سے انحراف ہو رہا ہے دراصل اس کی وجہ خواہشات و آرزوؤں کی تکمیل ہی ہے اس صورت حال نے موجودہ زندگی میں فلسفہ، علم و نظریات کی کئی شکلیں پیدا کر دی اور اس پر مباحثین نے عقل و فکر کی بنیاد پر خیال آرائی اور نکتہ سنجی سے طرح طرح کے افکار کو جنم دیا جس سے عیش پرستوں کا مقام (ADVANCE) اور بلند ہو گیا۔ یہ عیش پرستی ناز و نعم ان ہی افکار و نظریات کا نتیجہ ہے۔

اب غور و فکر کرنے کی بات ہے کہ یہ بگاڑ کیسے دور ہو۔ یہ صرف امید و آرزو فلسفۂ اسلام کو پیش کر دینے اور قلم و زبان سے برائیوں و اچھائیوں میں فرق کر دینے سے ہرگز یہ بگاڑ دور نہیں ہو سکتا بلکہ اس بیمار سوسائٹی کی مسیحائی کے لئے تبلیغ و دعوت کے ساتھ ساتھ قول و فعل میں مطابقت پیدا کر کے اسلامی سیرت کو واضح و منقح شکل میں پیش کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے قول و عمل میں تضاد سے یہ فساد و بگاڑ کبھی ختم نہ ہوگا۔

اسلام ہم سے یہی چاہتا ہے اور یہی اس کا مقصود بھی ہے، اس سے پہلے مسلمانوں کو اتنے سخت حالات کا مقابلہ نہیں تھا جتنا آج ہے اور خاص کر پندرہویں صدی ہجری تو طرح طرح کے چیلنج لے کر نمودار ہوئی، ایسے وقت میں ہمارا خاموش بیٹھنا یقیناً آیت قرآنی "ولتکن امۃ یدعون الی الخیر" کے منافی ہوگا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم علم و عمل کے ہتھیار سے لیس ہو کر اس دکھی انسانیت کو اس کا سبق یاد دلائیں۔ قرآن پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو عمل پر ابھارنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نوید قرآنی ہے۔ "وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمومنون" (آپ کہہ دیجئے کہ (جو چاہو) عمل کئے جاؤ سو ابھی دیکھے لیتا ہے تمہارے عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور اہل ایمان)۔

غزل

اقبال کوثر انصاری

میں بہت خوش ہوں جو مجھ پر یورشِ غم ہو گئی
چشمِ بینا کاتبِ قسمت کی محرم ہو گئی

زندگی اقلاء کے چلتی تھی باندازِ غرور
موت کے قدموں پہ گر کر نذرِ ماتم ہو گئی

زندگی پیغامِ ربانی سے آنکھیں پھیر کر
فتحِ ابلیس و شکستِ ابنِ آدم ہو گئی

ہر خوشی نے تیز کر دی آنے والے غم کی دھار
عید یوں آئی کہ عنوانِ محرم ہو گئی

ناامیدی سے رہِ امید نکلی بارہا
تشنگی اس درجہ مچلی موجِ زمزم ہو گئی

عشق کا سب سے بڑا خطرہ جسے پیش آگیا
عارضی ناکامیوں سے آرزو کم ہو گئی

بے سبب دل کو جھنجھوڑے دیتی ہیں بیتابیاں
آج لگتا ہے کہ وہ زلف برہم ہو گئی

زخم تھی جب تک ترا خطِ نگہ سیدھا نہ تھا
اب نظر نے زاویہ بدلا تو مرہم ہو گئی

بارہا اقبال دنیا میں اجنتا کی طرح
وقت کی تاریخ پتھر میں مجسم ہو گئی